ماہنامہ

قومی زبان

اسلم فرخی نمبر

بشکریہ: اسلم فرخی ڈاٹ کام

مجموعی کاوِش؛ عبداللہ عتیق

حسنین سیالوی

محمد حمید شاہد

ادبی تہذیب کا سچا نمائندہ ــــ ڈاکٹر اسلم فرخی

جب سے ہمارے ہاں سوشل میڈیا عام ہوا ہے، ادھر ادھر کی اچھی، بُری اور کچی پکّی خبریں جھٹ سے وہاں چڑھا دی جاتی ہیں۔ اب یہ آپ کی ذمے داری ہے کہ ان خبروں کی تصدیق کرتے پھریں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی رحلت کی خبر مجھے اس وسیلے سے ملی تو اس پر یقین کرنے سے پہلے میں نے جھٹ آصف فرخی کو فون ملالیا۔ آصف کی سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز سے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ایک عالم، ادیب، ایک خوب صورت نثر لکھنے والا اور ادب کی اپنی تہذیب کا سچا نمائندہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ آصف فرخی اپنے باپ کی ادبی وراثت کے امین ہیں۔ جب بھی ہمارا ملنا ہوتا، اُن کے والد صاحب کا ذکر بیچ میں ضرور آتا۔ جس روز آصف اپنے والد صاحب کی رحلت کی خبر کی تصدیق کر رہے تھے، انھی لمحوں میں، انہوں نے یہ کہا تھا کہ "وہ تو آپ کو بہت پسند کرتے تھے۔" تو یقین جانیے کہ میں اپنے آپ کو دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں سے ایک سمجھنے لگا تھا۔ یہ اطلاع میرے لیے نئی نہ تھی کہ انھوں نے میرے افسانوں کی ایک کتاب پر بہت محبت سے لکھا تھا، مگر ایسا ان کے ادیب بیٹے سے سننا میرے بدن میں عجب سنسنی سی بھر گیا تھا۔

شاید اس واقعے کو تیس سال ہو چکے ہوں گے کہ میں کراچی میں اُن کی رہائش گاہ پر انھیں دیکھنے گیا تھا، اس کے بعد بھی کئی مواقع نکلے، مگر جس اسلم فرخی سے میری ملاقات اُن کی نثر کے ذریعے ہوئی، یوں لگتا ہے کہ وہ مسلسل میرے وجود میں حاضر رہتے ہیں، یہ نثر بنا بنا کر نہیں لکھی گئی ہے، یہ تو ایک تہذیبی وجود کی عطا ہے۔ ذرا دھیان میں لائیے، اُن کے خاکوں کی کتابیں، مگر ٹھہریے! پہلے اُن کی، اس کتاب کا ذکر ہو جائے، جس میں انھوں نے سات کلاسیکی شعرا کی زندگیوں اور فن کا زائچہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ ہم ایک ایک شاعر کا تذکرہ پڑھتے ہیں اور لگتا ہے، جیسے لپک کر اُن بڑے شاعروں کے زمانے میں پہنچ گئے ہوں۔ میں "سات آسمان" کی بات کر رہا

ہوں، جس میں میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ اور محمد ابراہیم ذوقؔ وراثت میں ملا۔

ڈاکٹر صاحب، شاعری کے ان روشن میناروں سے ملانے محض ہمیں اُن کے زمانے میں لے جاکر ایک طرف نہیں ہو جاتے، اپنے زمانے کا چلن بھی دیکھتے رہے ہیں اور اسے کلاسیک سے جوڑ کر ایک تسلسل میں دیکھتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مطابق شاعری کی کلاسیکی روایت کے سات آسمانوں میں سے ایک آسمان شیخ امام بخش ناسخ بھی تھے، اُن کا ذکر آیا تو اسلم فرخی نے بتایا کہ اردو کی قدیم شاعری کے حوالے سے بعض اصطلاحیں بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوئی ہیں، مضمون آفرینی، خیال بندی، نازک خیالی، نیا مضمون پیدا کرنا، خیال کا طلسم باندھنا، خیال کی نزاکت، یہ ساری اصطلاحیں ناسخؔ کے یہاں معراجِ فن کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لگ بھگ ۹۲ برس عمر پائی، ایک ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے زمانے میں فرخ آباد سے کراچی آئے اور لگتا ہے اپنا فرخ آباد بھی ساتھ اٹھا لائے۔ اپنے گھر میں ادبی روایت کو قائم رکھا اور اپنی اولاد میں ادبی ذوق کو منتقل کیا۔ کراچی یونی ورسٹی سے منسلک رہے، وہاں رجسٹرار کے طور پر بھی کام کیا۔ انجمن ترقیِ اُردو پاکستان میں مشیرِ علمی و ادبی کے فرائض سرانجام دیے۔ ریڈیو پر بھی پروگرام کرتے رہے۔ شاعری کی، خاکے لکھے اور بچوں کے لیے بہت لائقِ توجہ کام کیا۔ تصوف سے رغبت رہی اور اس باب میں بھی اُن کا بہت اہم کام ہے۔ لطف یہ کہ اس سارے عرصے میں اُن کی توجہ اپنے کام پر رہی۔ اُن کے اس شعر میں اُن کی شخصیت کو تلاش کیا جاسکتا ہے:

کیوں گوشہ خلوت سے نکلتے نہیں اسلمؔ
بیٹھے ہیں جدھر لوگ، اُدھر کیوں نہیں جاتے

تو وہ بھیڑ بھاڑ کے کے آدمی نہ تھے، کتاب اور لفظ سے محبت کرتے اور اسی سے رشتہ نبھاتے رہے۔ شاعری کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب کی غزل سے دو شعر یاد آگئے، وہ بھی عرض کیے دیتا ہوں:

زد پہ آجائے گا جو کوئی تو مر جائے گا
وقت کا کام گزرنا ہے، گزر جائے گا

آگ سی لگ رہی ہے سینے میں
اب مزا کچھ نہیں ہے جینے میں

میرؔ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے ''سات آسمان'' میں لکھا تھا، ''میرؔ نے محبت کی بے زبانی کو زبان عطا کی ہے۔ محبت کا نغمہ ہر شاعر نے چھیڑا ہے، لیکن میرؔ کی محبت رسمی اور محدود نہیں۔ یہ اُن کے وجود کا بنیادی عنصر ہے۔ اُن کے رگ وپے میں رواں دواں ہے۔ محبت اُن کی فکر، اُن کا ذہن، اُن کا دل، اُن کی رُوح ہے:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

اس محبت میں بے راہ روی نہیں، باغیانہ جوش نہیں، نرمی اور دھیما پن ہے۔ جذبۂ تعمیر اور بہتر انسانیت کی تشکیل کا حوصلہ ہے۔''

محبت کے اسی وفور نے اگر میرؔ صاحب کو خدائے سخن بنایا تھا تو یہی محبت کا وفور اُن کی شخصیت کو باوقار بنا گیا ہے۔ میں اس وفور کو اگر ایک طرف ''نظام رنگ''، ''فرید و فردِ فرید''، ''فرمایا سلطان جی نے''، ''بچوں کے سلطان جی''، ''فرمایا خواجہ غریب نواز نے'' وغیرہ جیسی کتابوں سے اُمنڈتا برستا دیکھ سکتا ہوں تو دوسری طرف ''محمد حسین آزاد، شخصیت اور فن'' میں یا پھر ان کی لکھی ہوئی خاکوں کی کتابوں میں ''گل دستۂ احباب''، ''آنگن میں ستارے''، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' اور ''رونقِ بزمِ جہاں'' جیسی کتابوں کی معروف غیر معروف شخصیات کو یاد کیجیے، وہ ساری زندگی، جو ان شخصیات نے جھیلی آپ کی حسیات کا حصہ ہو جائے گی۔ کہنے کو یہ خاکوں کی کتابیں ہیں، مگر کہیں بھی شخصیت کی خاک نہیں بکھیری گئی، زندگی کو گفتنی ناگفتنی سارے پہلوؤں سے لکھا گیا ہے، مگر لفظ لفظ محبت سے لکھا گیا ہے، یوں کہ آس پاس کا منظر بھی اس محبت کی خوشبو سے مہکنے لگتا ہے۔

میں نے اُن کتب کو بھی دیکھا ہے، جو ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے لیے لکھیں، جن میں سے ایک کا ذکر اوپر ہو چکا اور آپ نے اس سے اندازہ لگالیا ہو گا کہ جن سے ڈاکٹر صاحب خود محبت کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے، اُن کی محبت کی مہک نئے زمانے کے بچوں کو بھی منتقل کرنا چاہتے تھے۔ ''بچوں کے مرزا غالب''، ''بچوں کے مولانا شبلی نعمانی''، ''بچوں کے مولانا حسرت موہانی'' اور ''بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد۔''

یہ تھا طریقہ ڈاکٹر صاحب کا کہ شخصیات کا بتاتے بتاتے اُن میں آگے بڑھنے کا حوصلہ اور کچھ کر لینے کی للک بھی پیدا کر دیتے تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کتاب ''بچوں کے رنگا رنگ خسرو'' ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے اندر صبر کی قوت اور ایمان مستحکم کرنے کے لیے وہ واقعہ بہت دلنشین انداز میں بیان کیا ہے، جس کے مطابق تا تاریوں کے حملے میں خسرو کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ تا تاری اُنھیں گھوڑے کے ساتھ باندھ کر گھسیٹتے ہیں۔ گھوڑا دوڑ رہا ہے۔ گرمی کا موسم ہے، اُوپر سے آگ برس رہی ہے۔ نیچے زمین تپ رہی اور خسرو کا سارا بدن چھل گیا ہے۔ بیابان میں گھوڑا دوڑتا ہوا ایک چشمے تک پہنچا ہے۔ تب تک تا تاری گھڑ سوار اور اس کا گھوڑا پیاس سے نڈھال ہو چکے ہیں۔ لہٰذا وہ پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ خسرو کو بھی پیاس نے ستا رکھا تھا، مگر انھوں نے صبر کیا۔ وہ جانتے تھے کہ فوراً ہی پانی پر ٹوٹ نہیں پڑتے، نقصان ہوتا ہے، گرمی سے ہانکتا سوار اور گھوڑا پانی پیتے پیتے اوندھے جا گرے، دونوں کا کام تمام ہوا، خسرو غلام ہونے سے بچ گئے، جو بھی بچہ اس واقعے کو پڑھتا ہے، اس کا تعارف صبر کی بے پنا قوت سے ہوتا ہے۔

یہاں تک پہنچا ہوں تو ڈاکٹر اسلم فرخی کی ایک اور کتاب ''صاحب جی، سلطان جی'' یاد آگئی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا اور سلاطینِ دہلی کے تعلقات کا جائزہ لیا۔ ایک مقام پر اُنھوں نے شیخ سعدی کا قول مقتبس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دس درویش ایک کملی میں گزارہ کر سکتے ہیں، لیکن دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں رہ سکتے۔'' وہ مزید لکھتے ہیں: ''اقتدار کسی اُبھرتے، ترقی کرتے، دلیر اور حوصلہ مند کو اپنے مقابل گوارا نہیں کرتا۔ اقتدار میں ایسا نشہ، سرور، ایسی کیفیت ہے کہ باپ بیٹے کو، بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کو، بھتیجا چچا

کو، چچا بھتیجے کو راستے سے ہٹانے میں کوئی تامل نہیں کرتا۔ ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا سکتا ہے، گردنیں مار سکتا ہے تو ایسے میں جو دلوں کو فتح کرلے ان کے ساتھ سلاطین کے تعلقات کیسے ہوں گے۔" دربار اور خانقاہ کی یہی کش مکش اس کتاب کا موضوع بنی اور ہمیں بہت کچھ سمجھا گئی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی غزل سے ایک اور شعر:

ہنگامۂ ہستی سے گزر کیوں نہیں جاتے
رستے میں کھڑے ہوگئے، گھر کیوں نہیں جاتے

ڈاکٹر صاحب ساری عمر علم اور ادب سے جڑے رہے، مگر ایک وقت آتا ہے کہ ہنگامۂ ہستی سے گزر جانا پڑتا ہے اور انھیں بھی گزرنا پڑا۔

شاہد حنائی

اردو خاکے کا وقار ــــ ڈاکٹر اسلم فرخی

(پیدائش: ۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۳ء، لکھنؤ ــــ وفات: ۱۵/ جون ۲۰۱۶ء، کراچی)

خاکہ نگاری بابائے اُردو کی محبوب صنف ہے۔ جب تک اُردو لکھی، پڑھی جاتی رہے گی، خاکوں کی کہکشاں جگمگاتی رہے گی۔ خاکہ مولوی صاحب سے پہلے بھی لکھا، پڑھا جارہا تھا اور آج بھی لکھا، پڑھا جارہا ہے۔ صنفِ خاکہ نگاری کی خوش بختی ٹھہری کہ اسے اُردو کے بلند پایہ اُدبا نے عزیز رکھا۔ محمد حسین آزادؔ سے لے کر ڈاکٹر اسلم فرخی تک خاکہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو نگاہیں جھک جھک جاتی ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ممتاز مفتی، مجتبیٰ حسین، حمیدہ اختر رائے پوری اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک سمیت ہر خاکہ نگار نے اپنے اپنے رنگ میں قلمی جوہر دکھائے۔ یہ ان باکمال خاکہ نگاروں کی عطا ہے کہ آج خاکہ درسی کتب سے لے کر ادبی تقریبات تک کی ضرورت قرار پاتا ہے۔

جب میں خاکہ نگاری میں لکھی گئی نثر کے نمونوں کی طرف دھیان کرتا ہوں تو ڈاکٹر اسلم فرخی کی نثر کو سب سے منفرد پاتا ہوں۔ مجھے گمان گزرتا ہے کہ الفاظ لکھنے کے بجائے موتی پروئے گئے ہیں۔ موتیوں کی مالا سے جملے مکمل ہوتے ہیں۔ یہ مالائیں یک جا ہو کر فقروں کی صورت قوس قزح بناتی ہیں۔ خاکہ نگار اسلم فرخی کو قرأت کرنے کے لیے قاری کا محض خواندہ یا تعلیم یافتہ ہونا ہی نہیں جوہر شناس ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کے سجے سنورے جملے پڑھ کر قاری ان کے قلمی کرشموں کا اعتراف کرتا ہے تو کبھی ان کی جادوئی اُنگلیوں کی تحسین کرتا ہے۔ وہ الفاظ سے ایسی شاہ کار تصویریں بناتے ہیں کہ موضوع یعنی شخصیت ہی نہیں مصوّر بھی نظر آنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کسی شخصیت کا خاکہ لکھتے وقت الفاظ کا انتخاب نہیں کرتے، لفظ لفظ کھوجتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ خاکے لفظی کشیدہ کاری کی عمدہ نظیر ہیں، الفاظ کی ترتیب، واقعات

کے انتخاب اور اختتامی تاثر کے ساتھ خاکہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کی محنت، مزاج اور ہنرمندی پوری سج دھج کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ قاری کبھی خاکے اور کبھی خاکہ نگار کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔ گذشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں کسی رسالے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کا تحریر کردہ خاکہ شاملِ اشاعت ہوتا تو مذکورہ رسالے کا وہ شمارہ اہم قرار پاتا۔ اس خاکے پر علمی و ادبی مجالس میں بحث کی جاتی اور وہ سرحد پار کے پرچوں میں بھی چھاپا جاتا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی مخصوص مزاج رکھتے تھے اور گوشہ نشیں شخصیت تھے۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں نے شائع ہو کر خاکہ نگار کو شہر شہر محفل نشیں کر دیا تھا۔ انھوں نے جن چند غیر معروف شخصیات کے خاکے لکھے وہ بھی نام دیومالی کی طرح معروف ہو گئیں۔ لگن اور جذب کے عالم میں لکھے گئے خاکے خاکہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کے ہی نہیں صنفِ خاکہ نگاری کا بھی مثالی تعارف قرار پاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں اگر ڈاکٹر اسلم فرخی خاکہ نگاری کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو اُردو ادب بالخصوص صنف خاکہ نگاری کی سیاہ بختی ہوتی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی اپنے موضوع یعنی شخصیت کو دیکھتے، پرکھتے ہی نہیں محسوس بھی کرتے ہیں۔ کردار کی کیفیات خود پر طاری کر لیتے ہیں۔ اس ریاضت کے ساتھ جب وہ خاکہ لکھتے ہیں تو کردار کا دُکھ قلم بند نہیں کرتے، اس کا درد روتے ہیں۔ محرومی کا کرب، طنز کی کاٹ اور پچھتاوے کا احساس تصویر کر دِکھاتے ہیں۔ اذیت قلم کے ذریعے ورق پر نقش کیسے ہوتی ہے! جذبات الفاظ میں کیسے دھڑکتے ہیں! سانسیں برف کیسے ہو جاتی ہیں! ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہ سب کچھ تحریر کی شکل میں سمجھا دیا ہے۔ یہ اپنے موضوع یعنی شخصیت سے ہمدردی کا راگ نہیں الاپتے، یک طرفہ وکالت نہیں کرتے، کھوٹے کو کھرا ثابت نہیں کرتے۔ یہ انسان کو اس کی اصل بود وباش، حرکات وسکنات اور عملی رویوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں بے چارگی، مظلومیت کی تصویریں نہیں ہوتیں، یہ جیتے جاگتے انسانوں کو سانس لیتے اور زندگی کرتے ہوئے دِکھاتے ہیں۔ کسی کردار میں اپنی مرضی کے رنگ نہیں بھرتے، کسی شخصیت کے اندر اُتر کر اس کی روح کو محسوس کرنا اور پھر اسی آہنگ کے ساتھ اظہار کر دینا ڈاکٹر اسلم فرخی کا خاصا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی خود سنجیدہ مزاج کی بردبار شخصیت ہیں۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں میں بھی

سنجیدگی کا عنصر غالب ہے لیکن یہ سنجیدگی کہیں بھی قاری میں بیزاری پیدا نہیں کرتی۔ ’حکیم چٹکلے باز‘‘ قدرے مختلف خاکہ ہے۔ خاکہ نگار نے حکیم صاحب کا دل چسپ کردار بیان کرتے ہوئے بے بنیاد لطائف گھڑنے اور مزاحیہ شعبدہ بازی دِکھانے کے بجائے ☆پُروقار شگفتگی کو ترجیح دی ہے۔ حکیم صاحب سمیت متعدد کرداروں کی حقیقی تصویر کشی میں طنز کی گنجائش نکلتی تھی مگر ڈاکٹر اسلم فرخی اپنی بلند فکری سطح سے نیچے اُترنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔ ان کی فطرت کا ثبات، ان کی نگاہ اور ان کی لکھت میں بھی شامل ہے۔ دراصل جو شے انسان کی فطرت میں شامل ہو، وہی اس کے مزاج کا تعارف بنتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی مہذب ڈاکٹر اسلم فرخی کسی کا خاکہ لکھتے وقت انسانی اقدار اور اخلاقی صفات کو کیوں کر نظر انداز کرسکتے ہیں۔ بزرگوں کی عام سی بات میں بھی تجربے کا وزن شامل ہوتا ہے۔ اس سچ کو ڈاکٹر اسلم فرخی کی تحریروں میں جابجا دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو خاکہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کے تحریر کردہ خاکوں میں خود خاکہ نگار سے بھی تعارف ہوتا ہے۔ اس یک طرفہ تعارف میں خاکہ نگار کے اوصافِ حمیدہ جھلک دِکھاتے ہیں۔ یوں قاری خاکہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کی فنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی خوبیوں کا بھی معترف ہوجاتا ہے۔

تصوف اور روحانیت سے شغف ڈاکٹر اسلم فرخی کی شخصیت کے لازمی اجزا میں شامل ہے۔ انھوں نے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کا ادبی خاکہ لکھا نہیں بلکہ تراشا ہے۔ احترام و عقیدت کے ساتھ ممدوح کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے مبالغہ آرائی سے بچ نکلنا ڈاکٹر اسلم فرخی کا کمال ہے۔ اگر وہ چاہتے تو اس خاکے کو طول دے سکتے تھے مگر انھوں نے بے جا تفاصیل سے گریز کیا ہے۔ انھوں نے معیار اور مقدار کی میزان کو کسی ایک طرف جھکنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کی لاثانی نثر کا ایک زمانہ مداح ہے۔ اچھی اُردو سیکھنے کے لیے میر انیسؔ اور ابوالکلام آزاد کو پڑھنا لازم ہے تو ڈاکٹر اسلم فرخی کو پڑھنا باعثِ فخر ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے مداحوں میں کئی نامی گرامی ہستیاں شامل ہیں۔ مجھ ناچیز کا شمار کسی قطار میں نہیں۔ میں اپنے تئیں شاد ہوں کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو پڑھا ہے، مجھے ان کے نیاز نصیب رہے ہیں۔ میں خود کو مبارک باد دیتا ہوں کہ میں ڈاکٹر اسلم فرخی کے عہد میں جیا۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ☆

اسلم فرخی — چند یادیں، چند باتیں

وہ ۱۹؍ جنوری ۲۰۱۰ء کی ایک انتہائی سرد اور کہر زدہ شام تھی جب ہم لاہور کے ہوائی اڈے پر اترے۔ ہمارے قافلے میں سب سے نمایاں تو محترم پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر آصف فرخی اور مبین مرزا بھی تھے۔ یہ عاجز ''شامل باجا'' تھا۔

دراصل محترم ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو، واقع اورینٹل کالج، میں محمد حسین آزاد کی صد سالہ برسی منانے کا انصرام اس طرح کیا تھا کہ ٹھیک سو سال بعد یعنی ۲۰؍ جنوری ۲۰۱۰ء کو دو روزہ آزاد سیمینار شروع ہو رہا تھا۔ ہم سب مقالے پڑھنے کے لیے کراچی سے مدعو کیے گئے تھے۔ ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر آتے ہی لاہور کی کٹیلی اور نکیلی سرد ہوا نے ''گرم جوشی'' سے استقبال کیا۔ اورینٹل کالج کے ڈاکٹر ضیاء الحسن ایر پورٹ پر موجود تھے وہ ہمیں لے کر جب گاڑی کی طرف لے جانے لگے تو ہم سب موسم پر خوش مزاجی سے تبصرے کرنے لگے۔ لیکن اسلم فرخی صاحب خاموش تھے۔ بس ہماری فقرے بازی پر ذرا سا مسکرا دیتے۔ اس وقت ذرا تشویش بھی ہوئی کہ شدید سردی کراچی والوں کے لیے لاہور کو کرۂ زمہریر بنا رہی تھی، اور ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت پچاسی (۸۵) برس کے لگ بھگ تھی۔ خاصے نحیف ہو چکے تھے۔

لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈاکٹر صاحب کی نظر گاڑی کی کھڑکی کے شیشوں پر پڑی جو سردی کی شدت کی وجہ سے نم آلود ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مصرع پڑھا۔ مصرع یاد نہیں لیکن دل کے ''آئینے کے مکدر'' ہونے کا ذکر تھا۔ مصرع پڑھ کر ڈاکٹر صاحب نے سحر انصاری صاحب کو مخاطب کیا اور کہا ''سحر صاحب، گرہ لگایئے''۔ سحر بھائی نے چند لمحے توقف کیا اور ایسا مصرع لگایا

☆ استاد شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، گشتی فون: ۰۳۰۰-۲۱۰۱۸۶۴

برقی ڈاک: drraufparekh@yahoo.com

کہ ہم سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔ فرخی صاحب کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہم نے دل ہی دل میں سحر صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں کو داد دی۔ یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ اس عمر میں بھی ڈاکٹر صاحب ذہنی اور جسمانی طور پر چاق و چوبند ہیں۔

خیر صاحب سیمینار کا آغاز ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان بلکہ کئی ملکوں کے نامور محقق اور اہل قلم موجود تھے۔ اسلم فرخی صاحب کو کلیدی مقالہ پیش کرنا تھا۔ یہ انتخاب ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ ظاہر ہے اس وقت ان سے بڑا آزاد شناس کوئی تھا بھی نہیں۔ اسلم فرخی صاحب نے مقالہ پڑھنا شروع کیا اور سماں باندھ دیا۔ ایک تو آزاد کا ذکر، پھر فرخی صاحب کی خوب صورت نثر۔ حاضرین ان کے مقالے اور زبان میں محو تھے۔ بعض لوگ بعض جملوں پر ہلکی آواز میں داد بھی دے رہے تھے۔ کچھ طالب علم بھی موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے سرگوشی میں کوئی بات کسی سے کہنی چاہی، معروف شاعر ناصر زیدی ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ بگڑ گئے اور دبی آواز میں اس طالب علم کو تنبیہ کی کہ "خاموشی سے سنو۔ یہ باتیں پھر سننے کو نہیں ملیں گی۔ اور ایک دن تم لوگ خود پر فخر کرو گے کہ ہم نے اسلم فرخی صاحب کو بولتے ہوئے سنا ہے"۔ اس جملے کی معنویت آج، جب فرخی صاحب ہم میں نہیں رہے، زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ واقعی مجھ طالب علم کو فخر ہے کہ میں نے اسلم فرخی صاحب کو بولتے ہوئے سنا ہے۔

اگلے دن صبح طعام گاہ (ڈائننگ ہال) میں اسلم فرخی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ذرا پہلے آ گئے تھے اور ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ آصف فرخی ان کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ میں نے پیش کش کی کہ یہ خدمت میں بجا لاؤں گا۔ آصف صاحب نے مسکرا کر اپنے والد کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ فرخی صاحب نے کہا، "پرسوں جب جہاز میں آپ نے مغرب کی نماز کا وقت پوچھا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو نماز کا خیال رہا۔ لیکن نماز کا وقت تو کراچی سے چلتے ہی ہو گیا تھا اور میں نے جہاز ہی میں نماز ادا کر لی تھی۔ آپ بیٹھیے میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔" لیکن یہ مناسب نہیں تھا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی دوا کا وقت ہو رہا تھا اور وہ کچھ آرام بھی کرنا چاہ رہے تھے کہ سحر خیز ہونے کی وجہ سے خاصی دیر سے جاگ رہے تھے۔ لہٰذا بیک وقت معذرت اور شکریہ کہہ کر واپس آ گیا۔

فرخی صاحب سے اس سے پہلے سر سری ملاقاتیں تو تھیں لیکن ربط ضبط اس وقت ذرا بڑھا تھا جب یہ خاکسار اردو لغت بورڈ کا مدیر اعلیٰ ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد ہم اپنے دو بیرونی ماہرین کی خدمات سے محروم ہو گئے۔ دراصل بورڈ کی لغت کے مسودے کا جتنا حصہ تیار ہوتا جاتا تھا اسے ہم بورڈ سے باہر ماہرین کی خدمت میں بھجوا کر ان سے رہ نمائی کی درخواست کرتے تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کو، جو ہمارے بیرونی ماہر تھے، ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا۔ دوسرے ماہر محمد سلیم الرحمن صاحب نے بوجوہ مزید نظرِ ثانی سے معذرت کر لی تھی۔ اس طرح محمد احسن خان اور دیگر چند ہی ماہرین رہ گئے جو ہماری لغت پر صحیح معنوں میں نظرِ ثانی کر سکتے تھے اور لغت پر کام کی رفتار متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جب اپنی پریشانی کا ذکر بورڈ کے صدر فرمان فتح پوری صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا کہ بھئی اب زبان و لغت جاننے والے چند ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ اسلم فرخی صاحب ان میں سے ایک ہیں، میں ان سے بات کرتا ہوں، شاید مان جائیں۔ فرخی صاحب فرمان صاحب سے بہت قریب بلکہ بے تکلف تھے۔ دونوں نے برسوں جامعۂ کراچی کے شعبۂ اردو میں ساتھ پڑھایا تھا اور دونوں میں کئی باتیں مشترک بھی تھیں۔ ایک تو دونوں عالم، محقق، زباں داں اور عروض کے ماہر۔ پھر دونوں خوش مزاج اور چھوٹوں پر شفقت کرنے اور ان کی رہ نمائی کرنے والے۔ دونوں نے غضب کا حافظہ پایا تھا اور بلا مبالغہ اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار دونوں کو ازبر تھے۔ اگلے ہی دن اسلم فرخی صاحب بورڈ کے دفتر میں موجود تھے۔ شاید فرمان صاحب نے انھیں فون کر دیا تھا۔ لیکن فرخی صاحب پہلے سیدھے اس فقیر کے کمرے میں آئے۔ نہ کوئی فوں فاں نہ اپنی بڑائی اور بزرگی کا کوئی احساس۔ بڑے انکسار سے آ کر سلام کیا۔ میں انھیں سامنے پا کر گڑبڑا سا گیا اور نشست سے اٹھ کر ان سے دعا سلام کی، کہا کہ آیئے فرمان صاحب کے کمرے میں چلتے ہیں۔ مجھے یہ گوارہ نہ تھا کہ میں ان کے سامنے اس طرح بیٹھوں کہ وہ ملاقاتی کرسی پر ہوں اور یہ نالائق میز کے دوسری طرف۔

فرمان صاحب کے کمرے میں پہنچے تو فرخی صاحب کے انداز میں دوستانہ بے تکلفی آ گئی اور فرمان صاحب سے کہنے لگے، ”کیا اتنی سردی میں پنکھا چلا کر بیٹھے ہو۔“ فرمان صاحب زور سے ہنسے اور جوابی فقرہ اچھالا۔ غرض دونوں بزرگوں نے متین ظرافت شروع کر دی اور میں ازراہِ

احتیاط چائے منگوانے کے بہانے سے باہر آ گیا۔ مختصراً یہ کہ فرخی صاحب نے لغت کے مسودے پر نظرِ ثانی کی ہامی بھرلی (کمپوزر صاحب، یہ ہامی ہے، اسے حامی مت لکھیے گا)۔ لیکن ان کے پاس لغت کی کچھ جلدیں کم تھیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو بھجوا دی جائیں گی۔ چیک بک نکالی اور کہا کہ کتنے پیسے لگیں گے۔ میں نے عرض کی ''سر! کیوں شرمندہ کرتے ہیں، لغت کے ماہرین کو تو ہم ویسے بھی یہ اعزازی طور پر فراہم کرتے ہیں''۔ لیکن اس چھوٹی سی بات سے فرخی صاحب کی اصول پسندی اور دیانت داری کا اندازہ ہوا۔ بورڈ کے کام کے لیے بھی انھیں بورڈ کی لغت کی کوئی جلد مفت لینا گوارہ نہ تھا۔ آخر فرمان صاحب نے اپنے بے تکلفانہ انداز میں انھیں قائل کیا کہ جلدیں خاصی وزنی ہیں آپ کے گھر پر پہنچادی جائیں گی۔ اور مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو لغت کے مسودے کا کچھ حصہ تنقیح کے لیے بھجوا دیا جائے۔

لیکن مجھے گوارہ نہ ہوا کہ مسودہ ڈاک سے یا چپراسی کے ہاتھ بھجواؤں، لہٰذا خود لے کر گیا۔ گھنٹی بجائی تو خود ہی دروازے پر آئے اور کہا کہ آپ نے کیوں زحمت کی۔ ویسے بے شک آیئے لیکن اب یہ تکلف نہ کیجیے گا۔ پھر اصرار کیا کہ ایک پیالی چائے پی کر جایئے۔ معذرت کی کہ دفتر چھوڑ کر آیا ہوں۔ پھر کبھی سہی۔ ان کی شرافت اور شفقت کا تاثر گہرا ہو گیا۔

ان کے گھر چھٹی کے روز صبح محفل جمتی تھی۔ بڑے بڑے لوگ آتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب، صدرِ شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، حیدرآباد سے آئے اور فرمائش کی کہ فرخی صاحب کے ہاں حاضری دینی ہے۔ سوچا اچھا موقع ہے۔ ان کے گھر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی محبت سے ملے۔ کئی لوگ تھے۔ انتظار حسین صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔

اسلم فرخی صاحب کا دین سے لگاؤ بہت واضح تھا اور اس میں باریکیوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ ایک بار دفتر کے کام سے اسلام آباد جانا ہوا۔ واپسی پر ہوائی اڈے کے روانگی کے کمرے (ڈپارچر لاونج) میں ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی کراچی جانے والی پرواز کے انتظار میں تھے لیکن میرے پاس کسی دوسری کمپنی کا ٹکٹ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو یونی ورسٹی کے کسی کام سے آئے تھے۔ پرواز میں کچھ دیر تھی۔ ان کے ساتھ وقت گزارنے کا اچھا موقع تھا لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے معذرت کی کہ عصر کی نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ اسلام آباد ایرپورٹ کے

لاونج میں مسافروں کی نشستوں کے ساتھ ہی جاے نماز ہے۔ غالباً مجھے دیکھتے رہے تھے کیونکہ نماز پڑھ کر آیا تو کہنے لگے "آپ نے قصر پڑھی نا، قصر کرنا لازم ہے"۔ انھیں یہ مغالطہ ہوا کہ میں نے قصر نہیں کی۔ لیکن نہ پوچھیے کہ کتنا اچھا لگا کہ اب بھی ہمارے ہاں ایسے بزرگ موجود ہیں جو ان باتوں کی احتیاط کرتے ہیں اور اپنے سے چھوٹوں کی رہ نمائی بھی کرتے ہیں۔ دین سے یہ لگاو ان کی کتابوں سے بھی ظاہر ہے۔ یہ یقیناً ان کے استاد حضرت ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب کی صحبت کا اثر تھا۔ ہوائی اڈے پر زبان اور لغت سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ افسوس کہ میرا جہاز پہلے تیار ہو گیا اور مجھے ان سے معذرت کر کے ان سے پہلے اٹھنا پڑا۔ اس مختصر سی ملاقات ہی میں انھوں نے کتنے ہی نکتے کام کے بتا دیے۔

لغت کا جو مسودہ انھیں بھیجا جاتا اسے بڑی دل جمعی سے دیکھتے۔ بورڈ کے بیرونی ماہرین میں ایک تو محمد احسن خان اور دوسرے ڈاکٹر اکبر قریشی مسودے کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے اور جا بجا اختلافی رائے اور ایسے الفاظ درج کر دیتے تھے جو مسودے میں شامل ہونے سے رہ جاتے تھے۔ ساتھ میں اسناد بھی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر یونس حسنی صاحب بھی مسودے پر گہری نظر ڈالتے تھے جو ان کے تاثرات اور اصلاحات میں جھلکتی تھی۔ وہ سند کے اشعار کی تصحیح بھی کر دیتے تھے۔ اسلم فرخی صاحب میں بھی یہی خوبی تھی۔ ان حضرات کے پاس سے تصحیح شدہ مسودہ واپس آتا تو میں اسے بڑے اشتیاق سے دیکھتا اور اپنے ساتھیوں کو بھی دکھاتا۔ وہ بھی خوش ہوتے کہ شکر ہے اغلاط کی اصلاح چھپنے سے پہلے ہی ہو گئی۔ لیکن فرخی صاحب کسی شعر یا مصرعے میں کتابت کی غلطی کو ہرگز معاف نہ کرتے تھے، اور کبھی کبھی سخت انداز میں لکھتے تھے کہ وزن سے گر گیا ہے تصحیح کرائیے۔ ہزاروں اشعار اردو اور فارسی کے نوک زباں تھے۔ کبھی مسودے پر بطور سند لکھ بھی دیتے تھے۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ کبھی ایک لفظ بھی ان کے لکھے ہوئے اشعار میں ادھر سے ادھر نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ بعض اہل علم کو دیکھا ہے کہ لفظ بھول گئے تو کوئی اور مترادف لکھ دیا گو وزن پورا ہو جاتا ہے۔ ابو الکلام آزاد نے بھی غبار خاطر میں کئی اشعار ایسے لکھے ہیں جو بحر میں ہیں لیکن اصل متن میں ذرا سی تبدیلی ہو گئی ہے (چونکہ جیل میں کتابیں تو تھیں نہیں کہ تصدیق کرتے)۔ البتہ اسلم فرخی صاحب ہمیشہ درست شعر لکھتے تھے اور حافظے سے، کیونکہ اس میں

دیوان کا حوالہ یا صفحہ نمبر نہیں ہوتا تھا اور ہمارا عملہ دیوان یا کلیات سے ان کا حوالہ درج کر دیتا تھا۔ کبھی ایک لفظ کا بھی فرق نہیں ہوتا تھا۔

ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس سے ان کے حافظے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک بار بورڈ کے دفتر میں فون کیا اور کہا کہ فارسی کے فلاں لفظ کی شعری سند چاہیے۔ پھر کہا کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے فرہنگِ آنند راج میں یہ لفظ دیکھا تھا اور اس کی سند میں یہ شعر بھی تھا۔ پھر فارسی کا شعر سنایا اور کہا کہ جانے کیوں شبہ ہو رہا ہے (شاید انھیں اپنے ذاتی کتب خانے میں کتاب تلاش کرنے میں دشواری ہوئی ہو گی)۔ میں نے کاغذ پر مختصر اشارے احتیاطاً لکھ لیے اور کہا کہ ابھی تھوڑی دیر میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ کتب خانے سے فرہنگ آنند راج کی متعلقہ جلد منگوائی اور لفظ اور سند دیکھی تو سرِ مُو فرق نہ تھا۔ میں نے فون کر کے بتایا کہ لفظ، معنی اور سند تینوں ہو بہو درج ہیں۔ بہت خوش ہوئے اور ہنستے ہوئے کہا مجھے ذرا سا شبہ تھا۔ پھر ''زحمت'' کی معذرت کر کے شکریہ ادا کیا۔ حالانکہ یہ زحمت نہیں رحمت تھی۔

اسلم فرخی استاد، محقق، خاکہ نگار، براڈ کاسٹر، شاعر، نقاد اور صاحبِ طرز تھے۔ بچوں کے لیے بھی لکھا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی پہچان ان کی نثر اور خاکہ نگاری بنی۔ فرخی صاحب کا شمار ان لکھنے والوں میں ہوتا ہے جن کا اسلوب ان کی شناخت بنا۔ ان کی نثر کا ایک خاص انداز ہے، یہ انداز خود اپنی پہچان کرا دیتا ہے۔ ایسی نثر لکھنا آسان نہیں جسے پڑھ کر قاری کہے کہ یہ تو فلاں کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ اسی کو صاحبِ طرز نثر نگار کہتے ہیں۔ فرخی صاحب کے خاکے لکھے ہوئے پڑھیے، آپ کو احساس ہو گا کہ کیسی دل کش اور نمایاں طور پر مختلف نثر ہے۔

دراصل اسلم فرخی صاحب محمد حسین آزاد سے بہت متاثر تھے۔ آزاد پر پی ایچ ڈی کی۔ آزاد کی کتابیں مرتب بھی کیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھوں نے آزاد کی نثر کا انداز اپنا لیا۔ آزاد کی نثر کی نمایاں خصوصیت ان کا اسلوب ہے جس میں قدیم و جدید کی آمیزش ہے۔ آزاد زبان اور محاورے کا بہت خیال رکھتے ہیں اور تشبیہات اور استعارات سے بیان میں رنگینی اور زور پیدا کر دیتے ہیں لیکن یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ تحریر اتنی رنگین اور گراں بار نہ ہو جائے کہ قدیم دور کی نثر کی طرح مغلق ہو کر ناقابلِ فہم ہو جائے اور معنی و مفہوم رنگینی اور صنائع بدائع کے بوجھ

تلے کراہنے لگیں۔ بلکہ آزادؔ کی نثر جدید دور کی نثر کی طرح رواں اور اور آسان بھی ہے لیکن زبان کا چٹخارا اور اسلوب کی رنگینی بھی موجود ہے۔ گویا آزادؔ نے مفہوم کے ابلاغ اور زبان کے حسن دونوں کو یکساں اہمیت دی۔ آزاد دراصل استاد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے جن کی محاورہ بندی مشہور ہے۔ محاورے اور روزمرے کی صحت کا آزادؔ کو بہت خیال تھا لیکن سرسیّد احمد خاں کے زیرِ اثر جدید دور کی سادہ نثر کی اہمیت اور اثراندازی کو بھی سمجھتے تھے۔ اس طرح آزاد کی نثر ایک عجیب دل کشی لیے ہوئے ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آزادؔ کی نثر ان کی شاعری سے زیادہ شاعرانہ ہے لیکن روانی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اسلم فرخی صاحب کی نثر میں بھی یہی خوبی ہے کہ آسان اور رواں ہے لیکن محاورے اور زبان کا لطف بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اردو کے محاورے اور روزمرہ پر دست رس، گہرا مشاہدہ اور خلوص و دل سوزی وہ عناصر ہیں جن کی آمیزش سے انھوں نے اپنی خاکہ نگاری کو خاصے کی چیز بنادیا۔ اسلم فرخی کا شمار دورِ حاضر کے اردو کے بہترین خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

اسلم فرخی کی تاریخِ پیدائش میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ بعض کتابوں میں ان کی تاریخِ پیدائش ۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۴ء درج ہے۔ کسی نے ۱۹۲۳ء بھی لکھا ہے، لیکن ان کی صحیح تاریخِ پیدائش ۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۶ء ہے، جس کی تصدیق ان کے صاحب زادے ڈاکٹر آصف فرخی نے بھی کی ہے۔

اسلم فرخی صاحب کا آبائی وطن فتح گڑھ، فرخ آباد (یوپی) ہے لیکن وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ فرخی صاحب کے نانا ادیب تھے، ان کے والد بھی شاعر اور ادیب تھے۔ غرض ان کے خاندان اور گھر میں علم و ادب و شعر کا چرچا تھا۔ حتیٰ کہ خاندان کی خواتین بھی شاعری کرتی تھیں۔

پاکستان بننے سے قبل فرخی صاحب نے مسلم لیگ کے لیے کام کیا اور پاکستان بننے کے بعد کراچی آ گئے۔ اردو کالج اور کراچی یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ ملازمت کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا جہاں مسودہ نگار (اسکرپٹ رائٹر) رہے۔ پھر شعبۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے اور ایس ایم کالج میں استاد ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج ناظم آباد اور سنٹرل کالج میں بھی پڑھایا۔ بعد میں جامعۂ کراچی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے اور

یہاں پروفیسر کے درجے تک پہنچ کر وظیفہ یاب ہوئے۔ جامعہ کراچی کے مُسجِّل یعنی رجسٹرار بھی رہے۔ انجمن ترقیٔ اردو میں طویل عرصے تک مشیر ادبی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

اسلم فرخی نے لکھنے کا آغاز بچوں کے معروف رسالے ''پھول'' سے کیا۔ فی البدیہہ لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ فارسی پر عبور تھا۔ انگریزی پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے لیکن اس کا کبھی اظہار نہیں کرتے تھے۔ اپنے استاد حضرت ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب سے بھی اسلم فرخی صاحب بہت متاثر تھے اور ان ہی کے سبب تصوف سے گہری دل چسپی پیدا ہوگئی۔ لہٰذا حضرت نظام الدین اولیا پر فرخی صاحب نے چھے (٦) کتابیں لکھیں یا مرتب کیں۔

اسلم فرخی دورِ حاضر کے معدودے چند صاحبِ طرز نثر نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کی نثر کا رنگ ان کے خاکوں میں خوب ابھرتا ہے۔ ان کے بعض خاکے نہ صرف اسلوب اور زبان کے لحاظ سے بلکہ فنِ خاکہ نگاری کے لحاظ سے بھی اردو کے بہترین خاکوں میں شامل ہیں۔

شمیم حنفی☆

آگ سی لگ رہی ہے سینے میں

یہ آگ کبھی کسی کو دکھائی نہیں دی اور یہی اسلم بھائی کی شخصیت کا سب سے بڑا کمال تھا، انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ قابو میں رکھا۔ وہ ایک انتہائی رچی ہوئی شخصیت کے مالک تھے اور دل پر جیسی بھی گزر رہی ہو، اس کے اظہار میں بہت محتاط تھے۔ تجربہ خوشی کا ہو یا غم کا۔ وہ اپنے آپ کو کبھی بھی پوری طرح ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایک عجیب و غریب ٹھہراو، ضبط اور تکلیف کا انداز انھوں نے اپنا لیا تھا۔ انھوں نے اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز، محمد حسین آزادؔ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، آپ اپنی پہچان بھی بنیادی طور پر اپنی انشا پردازی اور نثر کے ایک بے حد متین، مہذب اور خوش خرام اسلوب کے واسطے سے قائم کی۔ یہ اسلوب ایک ایسی تہذیب کا ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہوں اور جس کی ترکیب میں عجلت پسندی، بے احتیاطی، مبالغے، جذباتیت، اور تصنع کا ذرا بھی گزر نہ ہو۔ تحریر کے ساتھ ساتھ، عام گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اپنی تحریر و تقریر کے دوران وہ جو بھی لفظ، محاورہ، لہجہ اختیار کرتے ہیں، ان کے باطن پر وہ ایک تجربے کی طرح وارد ہوا ہو گا۔

فراق صاحب کو ایک اصطلاح بہت مرغوب تھی۔ اس اصطلاح کو انھوں نے اپنے مضامین میں اور بات چیت میں بارہا استعمال کیا اور برتا ہے۔ یہ اصطلاح تھی ”محسوس فکر“ یا Felt Ideas کی۔ ان کا ایک معروف شعر ہے:

☆کیا ہے سیر گہِ زندگی میں رخ جس سمت
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

گویا کہ ”خیالات بھی“ ”اشیا“ کی ہی ایک شکل ہیں، لہٰذا ان کا انتخاب بھی ہم سے گہری توجہ

☆پروفیسر ایمریطس، جامعہ ملیہ، دہلی

کا تقاضہ کرتا ہے۔ اپنی روزمرہ بات چیت میں بھی اسلم بھائی کا یہی طور تھا۔ اپنی گفتگو اور تحریر میں وہ خیالات کو اشیا میں اس طرح گھلا ملا کر پیش کرتے تھے کہ سننے یا پڑھنے والے کے لیے انھیں ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

اور یہی طور طریقہ تو آزاد کا بھی تھا۔ ''آبِ حیات''، ''دربارِ اکبری''، ''نیرنگِ خیال''، یہاں تک کہ ''سخن دانِ فارس'' کے موضوعات ایک اس کے موضوعات ایک دوسرے سے چاہے جتنے مختلف ہوں، مگر سب میں ایک وصف مشترک ہے۔ اشخاص اور اشیا کا بیان ہو یا افکار اور احساسات کا، ہم اسے صرف پڑھتے یا سنتے ہی نہیں، اسے دیکھتے، چھوتے اور چکھتے بھی جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ ایک جلوس سامنے سے گزر رہا ہے اور ہم اپنی تمام ☆حسوں کے ساتھ اس سے دوچار ہیں۔

اب تو اس واقعے کو تقریباً چالیس سال گزر چکے ہیں، مگر ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اسلم بھائی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سالانہ عرس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے اور اس موقعے پر خواجہ حسن ثانی نظامی ہر سال جو ایک مذاکرے کا اہتمام کرتے تھے، اسی میں اسلم بھائی کی تقریر بھی ہونا تھی۔ اپنے والد خواجہ حسن نظامی کی یاد میں ان کا تعمیر کردہ خواجہ ہال، اس مٹتے ہوئے شہر میں اب بھی ہمارے ثقافتی ورثے اور مشترکہ (ہند اسلامی) روایت کے سب سے یادگار مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مرکز کے اردگرد پھیلی ہوئی بستی حضرت نظام الدین، ایک ساتھ کئی زمانوں میں سانس لیتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسرو کے مزاروں پر ایک طرف کھرنی کے اس پرانے پیڑ کا سایہ ہے جو صدیوں پہلے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے لگایا تھا۔ وہیں ایک طرف شہزادی جہاں آرا کی سادہ، سنسان اور اداسی کے ایک نامعلوم احساس میں ڈوبی ہوئی قبر ہے۔ کچی مٹی سے ملحق سنگِ مرمر کے ایک کتبے کے ساتھ جس پر یہ شعر کندہ ہے:

سوائے سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمی گیاہ بس است

اس کے پاس ہی شمس سراج عفیف اور ضیاء الدین برنی کی قبریں ہیں اور تھوڑی ہی دور

پر، چونسٹھ کھمبا نامی تاریخی عمارت جس کے احاطے میں مزار غالب کے علاوہ متعدد مغل حکمرانوں اور شہزادوں کی ابدی آرام گاہیں بھی ہیں۔ اس علاقے کی جیتی جاگتی زندگی پر بھی قصے کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ عجیب علاقہ ہے اور زندوں کی عجیب بستی! ویسے بستی حضرت نظام الدین ہی نہیں، دلّی شہر کے تمام پرانے علاقوں کی فضا آج بھی کچھ داستانوی سی ہے۔ کھاری باؤلی کے گنجان محلوں میں ڈپٹی نذیر احمد کی دو پرانی شان دار سنگین حویلیاں ہیں۔ دنیا بدل گئی ان کا انداز نہ بدلا۔ ابھی کچھ ہی برس پہلے تک ان دو حویلیوں میں سے ایک میں، ڈپٹی صاحب کا خاندان آباد تھا۔ محمد مسلم صاحب اس خاندان کی یادیں محفوظ کیے ہوئے تھے۔ اپنی وضع کے انوکھے دلّی والے۔ اسلم بھائی کا جب بھی یہاں آنا ہوتا، مسلم صاحب سے ضرور ملتے تھے قیام چاہے جہاں ہو، کھاری باؤلی کی زیارت یقینی تھی۔ ایک آدھ بار میں بھی ساتھ رہا۔ ایسے موقعوں پر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی ☆طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا تھا کہ ہمارے گرد و پیش ماضی کا جال بچھا ہوا ہے کہ حال کا۔ اسلم بھائی نے دونوں جگہوں کے مابین ایک عجیب سمجھوتا کر رکھا تھا ایک ساتھ یہاں بھی، وہاں بھی، ان کی حالت ایک ایسے مسافر کی تھی جو بیک وقت دونوں سمتوں میں سفر کر رہا ہو۔ قیام بھی ہے اور سفر بھی جاری ہے۔

سفر پر یاد آیا — اسلم بھائی کو پرانے راستے، ان راستوں سے گزرنے والی سواریاں، ریل گاڑیاں، اسٹیشنوں کے نام اور ان کی پہچان کے نشان، خوب یاد تھے۔ قائم گنج، لکھنؤ، دلّی کے گلی محلے، جانے اَن جانے ہر طرح کے لوگ، چیزیں، ذائقے، آوازیں، موسم، فصلیں، صرف ان کے حافظے میں ہی زندہ نہیں تھے۔ ان کے تجربے میں بھی متحرک اور زندہ تھے اور اس زندگی میں برابر کے شریک جیسے وہ بظاہر کراچی کے گلشنِ اقبال میں بسر کر رہے تھے۔ حافظہ سامنے کی زندگی کے ساتھ اس زندگی میں بھی ہمیں شریک کیے رکھتا ہے جو کب کی غائب ہو چکی ہے۔ اپنے خالی وقت میں اسلم بھائی ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ بڑے انہماک سے کرتے تھے۔ جیسے انھیں لکھنؤ، ملیح آباد، کاکوری یا فرخ آباد کا سفر در پیش ہو۔ اسلم بھائی نے ایک دور میں نہیں بلکہ ایک زمانے میں اپنی عمر بسر کی۔ زمانہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ ہمارے سروں پر بادل کی طرح چھایا ہوا۔ یہ کیسی مجبوری ہے۔

شاید سی لیے، اردو کے تمام بڑے نثر نگاروں میں انھوں نے اپنا ماڈل محمد حسین آزاد کو بنایا۔ آزاد بھی ایک ایسی دنیا کے باسی تھے جس کا ہر ذرہ جان دار تھا۔ جہاں نیستی کا گزر نہ تھا۔ شبلی کے لفظوں میں حساس اور غیر حساس کا فرق نہیں تھا۔ گزشتہ اور موجود، دونوں ایک ساتھ سانس لیتے تھے۔ اسلم بھائی کے نام اور کام کی شہرت ہوئی، ان کے بلند مرتبہ تحقیقی مقالے محمد حسین آزاد کے واسطے سے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے شروعاتی دور میں، جب ان کی کتاب منظر عام پر آئی، اردو کی علمی اور ادبی دنیا میں جس کا تذکرہ ہر طرف ہوا۔ میں ان دنوں الٰہ آباد یونی ورسٹی کا طالبِ علم تھا اور احتشام صاحب (سیّد احتشام حسین) کی نگرانی میں اپنا مقالہ ترتیب دے رہا تھا۔ احتشام صاحب نے مشورہ دیا کہ ایک تو مولانا صلاح الدین (''ادبی دنیا'' سے رابطہ قائم کروں، دوسرے ڈاکٹر اسلم فرخی سے۔ مولانا صلاح الدین کے نام احتشام صاحب نے ایک تعارفی خط لکھ دیا تھا جس میں میرے تعلیمی ریکارڈ کا کچھ ذکر تھا اور کچھ سفارشی کلمات تھے۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ''ادبی دنیا'' میرے نام جاری کر دیا جس میں وہ ہر سال 'یومِ آزاد' کی تقریب میں ایک گوشہ بھی آزادؔ پر شائع کرتے آئے تھے۔ انھوں نے اسلم بھائی کی کتاب بھی وزیر آغا صاحب کے توسط سے مجھے بھجوا دی۔ وزیر آغا بھی آزادؔ کے شیدائیوں میں تھے اور ''ادبی دنیا'' کے حصۂ منظومات کی نگرانی اُس وقت اُنھی کے ذمے تھی۔ اس طرح وزیر آغا سے بھی تعلق قائم ہوا تھا جس نے ایک مستقل دوستی کی شکل اختیار کر لی۔ اس واقعے کے ساتھ زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔

یہی صورت اسلم بھائی کے سلسلے میں بھی پیش آئی۔ آزادؔ پر ان کی کتاب کے ساتھ اُن کی ایک خیالی تصویر بھی ذہن میں رونما ہوئی۔ احتشام صاحب اور ان کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی نے بھی یہ کتاب بہت پسند کی تھی اور اس سلسلے میں ایک خط بھی مجھے لکھا تھا۔ اس وقت مجھے کیا پتا تھا کہ آگے چل کر کسی روز اسلم بھائی سے ملاقات بھی ہو گی اور ان سے ایک شخصی تعلق استوار ہو گا۔ یہ ملاقات اس واقعے کے کوئی بیس اکیس برس بعد ہوئی جب وہ ایک زائر کے طور پر دلّی آئے اور خواجہ حسن ثانی نظامی کے مہمان ہوئے۔ سیمینار میں انھوں نے حضرت نظام الدین اولیا سے اپنی عقیدت کا اظہار ایک منقبت میں کیا۔ بہت جذباتی انداز تھا اور کسی کسی شعر میں تو یہ

گمان گزرتا تھا کہ وہ سلطان جی کے حضور وفورِ شوق کے ساتھ ان کے گُن نہیں گا رہے بلکہ اپنے باطن کی، ہلچل کا بیان کر رہے ہیں۔ اسلم بھائی کی طبیعت کا ٹھہراؤ اور ان کی گفتگو کے عام انداز کے پیشِ نظر بظاہر یہ ایک انہونی کیفیت تھی مگر انھوں نے سلطان جی کے علاوہ بھی جو خاکے لکھے ہیں، ان سے صاف پتا چلتا ہے کہ ان کا موضوع اشخاص اور شخصیات کے بہانے دراصل حال سے ماضی تک بکھری ہوئی ایک پوری کائنات ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کو اپنی آنکھ کے تل میں سمیٹ لیتے ہیں۔ مصور رضا (سیّد رضا حیدر) کے ''بندو'' کی طرح ان کی نگاہ صرف ایک نقطے پر، ایک چہرے یا ایک واقعے پر مرکوز نہیں ہوتی بلکہ یہ نقطہ ان کی گرفت میں آنے کے بعد بتدریج پھیلتا جاتا ہے اور چاروں طرف بکھرے ہوئے بے حساب مظاہر، شبیہوں، چیزوں کی کیفیتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ جس طرح آزادؔ (محمد حسین) کی نثر میں خیالات اشیا میں منتقل ہو جاتے ہیں اور پھر طرح طرح کے رنگوں، احساسات اور تجربوں کا ایک سلسلہ ایک جلوس سا مرتب ہو جاتا ہے، اسی طرح اسلم بھائی کے خاکوں میں بھی، چاہے ان کا ارتکاز ایک ہستی پر ہی کیوں نہ ہو، ایک بھری ☆پُری ہو گا، رنگا رنگ دنیا آباد ہو جاتی ہے، ایک فرد کے ساتھ ایک اجتماع کے رخ سے پردہ اٹھتا ہے اور ایک فرد، یا ایک جذبے اور ایک خیال کے ساتھ بہت سے افراد، جذبات اور خیالات کی بہت سی لہریں سامنے آتی جاتی ہیں۔ ان کی درد مندی اور انسان دوستی کا ایک وسیع و عریض نگار خانہ کھلتا جاتا ہے اور ایک داستان شروع ہو جاتی ہے۔ انھوں نے ہر طبقے اور ہر سطح کے افراد کی لفظی تصویریں بنائی ہیں۔ مگر ہر خاکے کے کینوس پر ہمیں ایک پورٹریٹ کے بجائے دراصل ایک میورال کی نقاب کشائی کا تجربہ ہوتا ہے۔ بہت سی گہری قدروں اور باتوں تک ہماری رسائی بظاہر بہت معمولی اور بے بساط کرداروں کے واسطے سے ہوتی ہے۔ ان کے بیش تر خاکے روزمرہ زندگی کے ایک سلسلے اور ہماری ثقافتی اور تہذیبی یادداشت اور تاریخ کے ایک قصہ در قصہ بیان پر مبنی ہیں۔ انسانی زندگی کو درپیش آنے والے مسئلوں اور تجربوں میں سب سے کھرے، سچے اور عام مسئلے یا تجربے وہی ہوتے ہیں جو معمول کی زندگی کا حصہ ہوں، جن میں بظاہر عظمت کے آثار نہ ہوں، کسی طرح کا غیر معمولی پن نہ ہو۔ تحریر و تقریر میں بیان کی کوئی ایسی صورت جو مصنوعی، اختراعی اور کھینچ تان کر وضع کی گئی ہو اور جس کے ذریعے بیان کنندہ نے خود کو اپنی بساط سے زیادہ

نمایاں کرنے اور دکھانے کے جتن کیے ہوں، تحریر و تقریر میں خوبی کے بجائے خرابی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ ہماری علاقائی زبانوں، بالخصوص بنگالی، گجراتی، ملیالم اور تمل میں جن مصنفوں کے یہاں عالم گیر عظمت کے عناصر اور دریافت کیے گئے ہیں، اپنی سادگی اور ''معمولی پن'' سے پہچانے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو اور ہندی کا مرکزی دھارا (mainstream) بھی یہی سادگی، عمومیت اور مانوسیت ہے۔ انہی عناصر نے میر امن، غالب، پریم چند، منٹو اور انتظار حسین کی نثر کو اردو کے ایسے ادیبوں کی بہ نسبت زیادہ وقیع بنایا ہے جو فارسی آمیز زبان کے ذریعے اپنے اسلوب کو بھاری بھرکم بنا کے دکھاتے ہیں۔ یوں بھی تخلیقی نثر کو علم نمائی راس نہیں آتی۔ فطری سادگی، سلاست اور روانی کے اوصاف بظاہر معمولی سہی لیکن یہی اوصاف تخلیقی نثر میں انوکھا پن کشش اور جمالیاتی ذائقہ پیدا کرتے ہیں۔ اچھی نثر کے حسن اور زندگی کے حسن میں بالعموم دوری اور بیگانگی نہیں ہوتی اور اس خوبی کا ظہور نثر و نظم میں ایک طرح کی خلقی انسان دوستی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلم بھائی کی نثر بھی پڑھنے والے کو مرعوب نہیں کرتی۔ اپنے غیر معمولی ہونے کا احساس نہیں دلاتی۔ شخصیت کو اسلوب پر مسلط نہیں کرتی اور دور افتادہ مضامین یا ''عظیم افکار'' کی شمولیت سے اپنے آپ کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ یہ ایک ''☆پُر فریب'' خوبی ہے، ایک ''☆پُر کار'' سادگی جس سے اردو نثر و نظم کے ہر دور میں بہت کم لکھنے والے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ اسلم بھائی پر اردو انشاپردازی کی روایت کا ایک دور ختم ہوا۔

مجھے شاعری میں یا تخلیقی نثر میں لکھنے والے کا اپنی ''شخصیت سے گریز'' کا رویہ، کبھی قائل نہ کر سکا۔ ایلیٹ کے بصیرت آمیز دلائل کے باوجود، مشرقی ادب اور اظہار کے عام اسالیب کی روشنی میں یہ رویہ شاید قابلِ قبول ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے بہت سے ''ہنر'' مغربیوں کے نزدیک ''عیب'' ہیں۔ مثلاً شبیہ سازی اور قادر الکلامی کا ہنر۔ کیا ضروری ہے کہ ہر استعارہ تشبیہ سے آگے ہو اور قادر الکلامی محض لفاظی۔۔۔! اردو نقادوں میں شاید صرف ممتاز حسین نے (ادب اور شعور میں) اس سوال کو سوچ بچار کا موضوع بنایا ہے اور اسی سوال سے وابستہ ایک اور اہم مسئلے یعنی مغرب اور مشرق کے تصور حقیقت میں ایک بنیادی فرق و امتیاز کو تہذیبی، ثقافتی اور فکری روایات کے فرق کی روشنی میں سب سے زیادہ گہرائی کے ساتھ شاید صرف عسکری صاحب نے سمجھنے کی

کوشش کی ہے۔

خیر، یہ ایک لمبی بحث ہے اور اس کے لیے ایک الگ تفصیل چاہیے اسلم بھائی نے اپنی تحریروں میں لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے اختیار کردہ اسلوب کے روابط اور رشتوں کو ایک بنیادی سچائی کے طور پر دیکھا اور دکھایا ہے۔ کئی سطحوں پر اپنے ہیرو محمد حسین آزاد کی طرح۔ اس تلاش میں وہ آزادؔ کے عہدِ ☆ جنوں کی کتابوں تک گئے ہیں۔ انھوں نے ایک سادہ، وضع دارانہ اور بڑی حد تک خاموش زندگی گزاری۔ ادھر برسوں سے ان کے روشن چہرے پر گرد ملال کی ایک مصرعے کے مطابق۔ اب مزہ کچھ نہیں ہے جینے میں۔۔۔! لیکن ان کے سینے میں کیسی آگ لگی ہوئی تھی جسے وہ اپنے ثقافتی حافظے اور اپنی لمبی چپ کے ذریعے چھپائے رکھنا چاہتے تھے، کچھ پتا نہیں چلتا۔ بہ قولِ غالبؔ:

ہے ہر اک شخص جہاں میں ورقِ ناخواندہ!

جسٹس (ر) حاذق الخیری

پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی

پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی پر بات کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں، بات شروع تو ہوگئی ہے لیکن ختم نہیں ہوسکتی کیوں کہ اُن پر بات کرنے والے کم نہ ہوں گے۔ انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری، درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ مترجم، محقق استاد، ادیب، شاعر اور منتظم، صوفی مزاج اور قناعت پسند انسان تھے۔ ان کی تحریر کردہ ہزاروں صفحات پر مبنی تصانیف عہدِ رفتہ و عہدِ حاضر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ تصوف کے میدان میں اُن کی وارفتگی اور عقیدت نے ان سے انھیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی حیات و کرامات پر مبنی دبستانِ نظام تحریر کروائی۔ تحقیق کی صنف میں ان کے دلی لگاؤ نے انھیں مولانا محمد حسین آزاد کی شخصیت اور ادبی کارناموں کی جانب کھینچا تو ایسا کہ اردو ادب میں ڈھونڈو تو اس کا ثانی نہیں ہے اور ہاں خاکہ نگاری میں انھیں ایک بلند و بالا اور اعلیٰ مقام حاصل ہے، ان کی کردار نگاری اپنی تمام تر واقعات و جزئیات کے ساتھ ایسی ہے کہ ان خاکوں سے خود اُن کا خاکہ مختلف رنگ و روپ لیے ابھرتا ہے، ایسی ہمہ جہت شخصیات کم ہی نظر آتی ہیں۔

میری ادبی زندگی بہت مختصر رہی ہے۔ ایک افسانوں کی کتاب ”گزرتی شب“ اور دو ڈرامے زمانۂ طالب علمی اور وکالت کی یادگار ہیں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باعث اُردو ادب کی رفتار سے خاصا بیگانہ رہا۔ اپنے فرائضِ منصبی سے فارغ ہوا تو اُردو ادب پر نظر ڈالی، خاصی مایوسی ہوئی، ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط اور ہندی زبان ہونے سے اُردو زبان کو بے انتہا نقصان پہنچا۔ پاکستان میں بہرحال اُردو زبان کی ترقی ہوئی لیکن اُردو ادبی رسالے جو گھر گھر ہر ماہ جاتے تھے، مفقود ہوگئے۔ یہ کس مپرسی کا عالم آج کا نہیں ہے بلکہ پچاس کی دہائی سے ہی شروع ہوچکا تھا۔ پاکستان کے جمے جمائے ادبی رسائل کے اسی فی صد پڑھنے والے ہندوستان میں تھے اور ہندوستانی اور پاکستانی روپوں میں برابری کی بنیاد پر لین دین ہوتا تھا۔ پچاس کے اوائل میں

ہندوستان نے اپنے روپے کی قدر کم کرلی جب کہ پاکستان نے نہیں کی، جس کا شدید دھچکا ادبی رسائل کو لگا اور ادبی رسائل کا ہندوستان کے خریداروں سے رشتہ ختم ہو گیا، ساتھ ہی ساتھ کاغذ کی گرانی اور بلیک مارکیٹ شروع ہو گئی۔ ان گوناگوں مشکلات اور کس مپرسی کی حالت میں میرے والد مولانا رازق الخیری ایڈیٹر ''عصمت'' نے جناب شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر ''ساقی'' کے تعاون سے انجمن ادبی رسائل کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ طے یہ ہوا کہ انجمن کا ایک جلسہ ۱۳/ اگست ۱۹۵۳ء کو لاہور میں منعقد ہو اور یہ بھی طے پایا کہ جناب حامد علی خاں ایڈیٹر ''الحمرا'' لاہور کے تعاون سے ایک تقریب منعقد ہو جس میں جناب فیروز خان نون چیف منسٹر پنجاب کو بحیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کیا جائے۔ میری پہلی ملاقات پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی سے اُسی زمانے کی ہے۔ وہ اور جناب شمس زبیری مرحوم، چچا شاہد احمد دہلوی کے ہمراہ تھے اور میں والد صاحب کے ساتھ، ہمیں کراچی سٹی ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہونا تھا اور ہمارا کمپارٹمنٹ ریزروڈ تھا۔ کئی اور مدیرانِ جرائد کے علاوہ ہمارے ساتھ ایک طبّی میگزین کے ایڈیٹر اور حکیم تھے لیکن اپنے آپ کو ڈاکٹر کہتے اور لکھتے تھے۔ میں اُن کا اصلی نام نہیں لوں گا بلکہ انھیں کسی وجہ سے ڈاکٹر یوسف کہوں گا۔

محترم اسلم فرخی کی جوانی کا زمانہ تھا، وہ چچا شاہد کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے تھے، وہ پہلو بدلتے تو چوکنا ہو جاتے جس میں احترام و عقیدت دونوں شامل تھے، احترام تو اس لیے بھی کہ ان کے سسر جناب سراج احمد چچا شاہد کے سگے بھائی تھے۔ چچا شاہد میرے بھی رشتے کے چچا تھے۔ میرے لیے بھی ان کا احترام لازم تھا۔ ان کے دادا ڈپٹی نذیر احمد سے میرے دادا علامہ راشد الخیری کی سگی پھوپھی کی شادی ہوئی تھی اور ان کی پڑپوتی ڈاکٹر اسلم فرخی کی بیگم ہیں۔

دورانِ سفر ڈاکٹر اسلم فرخی کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ میں بی اے کا طالبِ علم ہوں اور ایم اے ایل ایل بی کروں گا۔ کہنے لگے ایل ایل بی کیوں؟ کیا وکالت کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے، تمھارے بڑے بھائی تو فارن سروس میں چلے گئے ہیں۔ اب باپ دادا کی گدی کون سنبھالے گا اور ان کی روایت کو کون لے کر چلے گا۔ میں کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ کہنے لگے، تم افسانے بھی لکھتے ہو، لکھا کرو۔ راستے میں خیبر میل سے کھانا آیا تھوڑا بہت کھایا بلکہ زہر مار کیا۔ بیش تر لوگ دلّی یا اس کے گرد و نواح کے تھے جن کو مطلب کا کھانا نہ ملے تو طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے۔

ہمارے ''ڈاکٹر یوسف'' نے اس موقعے پر ترکاریوں پر اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ خاص طور سے کدّو کے فوائد پر دیر تک بولتے رہے۔ کہنے لگے کہ معدے کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے، گرمی دور کرتا ہے اور زود ہضم ہوتا ہے۔ کدّو کی اتنی خاصیتیں سنیں تو ان کا نام ہی ڈاکٹر کدّو پڑ گیا۔ راستے بھر انھیں اسی نام سے پکارتے رہے لیکن وہ برا بالکل نہیں مانے مسکراتے ہی رہے۔ ہر اسٹیشن پر میں، ڈاکٹر اسلم فرخی اور جناب شمس زبیری چائے لینے اترتے اور بزرگوں کو چائے پیش کرتے۔ چائے گرم ہوتی تو ڈاکٹر کدّو پرچ میں اُنڈیل کر غٹاغٹ پی جاتے۔ جب حیدرآباد اسٹیشن آیا، پکوڑے خریدے گئے تو شکم سیر ہوئے۔

کافی رات تک اردو ادیبوں کے قصے چلتے رہے۔ بات ایم اسلم سے شروع ہوئی جن کے افسانے ''ساقی'' میں باقاعدگی سے چھپتے تھے لیکن وہ ادب میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے۔ چچا شاہد نے کہا، ایم اسلم بڑا وضع دار انسان اور اچھا دوست ہے۔ میں لاہور میں اس کے ہاں ہی قیام کرتا ہوں۔ پھر ذکر چھڑ گیا چچا شاہد کے دوست جناب فضل حق قریشی سابق نائب مدیر ''آجکل'' دہلی اور مدیر ''ماہِ نو'' کراچی کا جو اپنی شوخ و چنچل کارستانیوں سے خود بھی اور دوستوں کو بھی محظوظ کرتے تھے۔ بات پہنچی خیالی اور نام نہاد طاہرہ بیگم شیرازی اور عظیم ادیب، علامہ نیاز فتح پوری کی خط کتابت تک، چچا شاہد نے یہ بھی بتایا کہ دلّی سے ہجرت کر کے وہ لاہور سے ''ساقی'' نکالنا چاہتے تھے لیکن انھیں اس کا ڈیکلریشن نہ ملنے پر انھوں نے کراچی میں رہائش اختیار کی اور یہاں سے ہی ''ساقی'' نکالا۔ وہ کچھ عرصہ لاہور ہیں میڈیکل کالج کے طالب علم بھی رہے۔

رات بہت ہو چکی تھی، والد صاحب نے کہا اب سو جاؤ اور بتیاں گل کرو۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اوپر کی ایک برتھ پر اور میں سامنے کی دوسری برتھ پر چڑھ کر سو گئے۔ صبح ڈاکٹر کدّو نے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلا کر اٹھایا۔ والد صاحب سگریٹ پی رہے تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی سفید کُرتا اور تنگ موری علی گڑھ کٹ پاجامے کے ساتھ اترے، ہم سب نے ناشتہ کیا اور پھر لاہور آ گیا۔ اسٹیشن پر احمد ندیم قاسمی، حامد علی خان اور میرزا ادیب نے ہمارا استقبال کیا۔ اگر یہ بتاؤں کہ لاہور کے جلسے میں کیا ہوا تو بات طول پکڑ لے گی۔ بہر حال ادبی رسائل کی حالت کسی حد تک بہتر ہوئی کہ کاغذ کنٹرول ریٹ پر ملنے لگا۔ کانفرنس ختم ہونے پر یہ قافلہ تتر بتر ہو گیا اور فرخی صاحب بھی لاہور کے

ادیبوں کے ساتھ گھل مل گئے اور میں اپنے اسکول کے ساتھی اور دوست راشد اشرف (بی بی سی اردو سروس) کے ہمراہ ان کے گھر نسبت روڈ پاک ٹی ہاؤس میں ان کی ٹولی کے ساتھ ان کے رحم و کرم پر رہا۔ یہاں ایک تصحیح کرنا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ ڈاکٹر فرخی نے "زندہ انسان" میں جو چچا شاہد کا خاکہ کھینچا ہے، اس میں صفحہ ۷۱ پر انھوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ "۸۴ء کے آخر میں صدر کی کتابوں اور رسالوں کے ایک اسٹال پر 'ساقی' نظر آیا۔" غالباً یہ غلطی کمپوزنگ کی وجہ سے ہوئی، ورنہ پاکستان بننے کے چند سال بعد ہی کراچی سے "ساقی" دوبارہ جاری ہو گیا تھا۔

مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ چچا شاہد کو روزگار کے سلسلے میں روزانہ پیر الٰہی بخش کالونی سے سائیکل پر سوار ہو کر چار پانچ میل دور ریڈیو پاکستان جانا پڑتا تھا جو اس وقت کوئنز روڈ پر واقع تھا۔ میں خود اس وقت سائیکل پر کالج اور کافی ہاؤس جاتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ کراچی میں تیز ہواؤں کے جھکڑ میں سائیکل چلانا دوبھر ہو جاتا تھا۔ یہ پڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ مجھے اپنے والد کا کہا یاد آتا ہے کہ ہم نے پاکستان اپنے لیے نہیں، اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بنایا ہے۔

چند دن لاہور میں قیام کے دوران والد صاحب کو جناب امتیاز علی تاج اور حجاب امتیاز علی نے کھانے پر بلایا جہاں جسٹس ایس اے رحمان اور جناب عبدالرحمن چغتائی بھی موجود تھے۔ باتوں باتوں میں جناب عبدالرحمن چغتائی نے پوچھا کہ "عصمت" کو نکلتے ہوئے کتنے سال ہو گئے؟ والد صاحب نے کہا اب تو ۴۶ سال ہو گئے ہیں۔ چغتائی صاحب نے کہا، جب چار سال بعد آپ اس کا "گولڈن نمبر" شائع کریں گے تو اس کا سرورق میں بناؤں گا۔ یہی ہوا کہ "عصمت" کے "گولڈن جوبلی نمبر" کا سرورق چغتائی صاحب نے بنایا۔ پھر اس کے بعد ایسا ہوا کہ کراچی بلکہ پاکستان کے پہلے ایئر کنڈیشنڈ ریستوراں Gaylord Restaurant میں مشہور آرٹسٹ صادقین نے ایک ملاقات کے دوران مجھ سے کہا "عصمت" کے ساٹھ سالہ "الماسی نمبر" کا سرورق وہ بنائیں گے۔ ایسا ہی ہوا، بات سے بات نکلتی ہے۔ پرانے رسالوں میں اب "عصمت" ہی لے دے کر ایک رہ گیا ہے، جو ۱۰۷ سالہ بوجھ اٹھائے گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہے۔

کوئی چودہ پندرہ سال تک میری ڈاکٹر اسلم فرخی سے کوئی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی، کبھی

ملے بھی تو بس علیک سلیک کی حد تک۔ ۱۹۶۶ء میں جب میں پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی ریجن کا اعزازی سیکریٹری بنا، تب بھی واجبی سی ہی ملاقات رہی۔ اس موقعے پر انھوں نے بے شک کہا کہ اب آپ ادیبوں کی خدمت کیجیے، اپنے باپ دادا کی طرح۔ سچ بھی یہی تھا کہ میں گلڈ کا سیکریٹری منتخب ہی باپ دادا کی نیک نامی کی وجہ سے ہوا، ورنہ مجھ سے پہلے چچا شاہد احمد دہلوی اور جناب ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے عظیم ادیبوں نے کراچی ریجن کے اعزازی سیکریٹری کے فرائض انجام دیے تھے۔

میں اس دور میں وکالت کے پیشے میں داخل ہو چکا تھا اور ہفتے میں دو ایک بار سندھ مسلم لا کالج میں لیکچر بھی دیتا تھا۔ ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۷ء تک میں ساڑھے سات سال کالج کا پرنسپل بھی رہا، کالج شام کو ہوتا تھا۔ غالباً دسمبر ۱۹۸۲ء کی بات ہے، محترمہ بینظیر بھٹو نظر بند تھیں۔ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا، ایک دن ان کا فون آیا کہ وہ لا کالج میں داخلہ لینا چاہتی ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ داخلے کبھی کے بند ہو چکے ہیں بلکہ امتحانات بھی ہو چکے تھے۔ رزلٹ آنے والا ہے، آپ فروری مارچ ۱۹۸۳ء میں داخلہ لے لیں۔

فروری مارچ میں ایل ایل بی پارٹ ون میں داخلے شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے لیکن وہ داخلہ لینے نہیں آئیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ کراچی کے تینوں لا کالجز کی سیٹوں کی مقررہ تعداد کا تعین کراچی یونی ورسٹی کرتی تھی۔ پچھلے سال چند مقررہ سیٹوں سے زیادہ داخلوں پر مجھے یونی ورسٹی سے شوکاز نوٹس دیا گیا تھا۔ مئی ۱۹۸۳ء میں ہوم ڈیپارٹمنٹ، حکومتِ سندھ کی طرف سے ایک خط آیا کہ محترمہ بینظیر ایل ایل بی پارٹ ون میں داخلہ لینا چاہتی ہیں، چونکہ داخلے بند ہو چکے تھے اور فائنل لسٹ یونی ورسٹی جا چکی تھی، اس لیے میں نے کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کو خط لکھا کہ ہمیں ایک سیٹ مزید دی جائے تا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کو ہم داخلہ دے سکیں۔ خط کا جواب نہیں آیا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ نے دوبارہ لکھا اور میں نے وائس چانسلر کو یاد دہانی کرائی لیکن جواب ندارد، اس طرح محترمہ بینظیر بھٹو کا داخلہ رہ گیا جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ وقت گزرتا گیا۔ کچھ عرصے بعد جب میں ۱۹۸۸ء میں ہائی کورٹ کا جج بنا تو محترمہ بینظیر بھٹو کے اعزاز میں ہائی کورٹ بار کی طرف سے ڈنر کا اہتمام کیا گیا۔ تقریر کے دوران وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور کہا کہ میں اپنے مقدموں میں ہائی کورٹ کے برآمدوں میں گھومتی پھرتی تھی

اور سوچتی تھی کہ لاکالج میں داخلہ لوں لیکن مجھے پرنسپل صاحب نے داخلہ نہیں دیا۔ لیکن اس مسکراہٹ میں خفگی نہیں تھی، اُن کو غالباً میری مجبوری کا علم تھا۔

یہاں میں ذکر کروں گا ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکے ''اختر صاحب'' کا، اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''حضرت امیر خسرو نے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔'' اسی طرح اختر صاحب نے سات وائس چانسلروں کے ساتھ بحیثیت معاونِ ذاتی کے طور پر فرائض انجام دیے، لیکن جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، ان ساتوں وائس چانسلروں میں سے کوئی نہیں تھا بلکہ اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسلم فرخی کے ایک بہت ہی قریبی عزیز تھے۔ پھر بھی میں نے ہمت کر کے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ وائس چانسلر صاحب نے آخر میرے خطوط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑی توجہ سے سنتے رہے، پھر رُک کر بے تکلفی سے بولے، بھئی کوئی مصلحت ہو گی، مجھے ان باتوں کا علم نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا، ڈاکٹر صاحب! اگر ایسا ہوتا تو بینظیر بھٹو میری شاگرد ہوتیں! بینظیر بھٹو کا کالج پر حق اور تعلق یہ بھی تھا کہ ان کے والد جناب ذوالفقار علی بھٹو، ایوب خان کے مارشل لا لگنے تک اس کالج میں پڑھاتے تھے۔

ان سات وائس چانسلروں کے زمانے کی بات ہے، ڈاکٹر صاحب نے یونی ورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ایک موقعے پر وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی نے انھیں بلوایا اور کہا کہ ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں کام کروں تو رجسٹرار کے کمرے میں جا کر کرسی سنبھالیں۔'' کیا بات تھی جالبی صاحب کی! ڈاکٹر فرخی نے جا کر کرسی سنبھال لی اور کراچی یونی ورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے اس سے پہلے بھی کراچی یونی ورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے لیے ڈاکٹر اسلم فرخی کا انٹرویو ہوا تھا اور وہ بھی بڑے ڈرامائی انداز میں۔ جب وہ سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوئے تو ڈاکٹر احسان رشید وائس چانسلر تھے، انھوں نے اس موقعے کی مناسبت رکھتے ہوئے ان سے کہا کہ کوئی فی البدیہ شعر کہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر بے دھڑک ایک فی البدیہ شعر پڑھا:

نہ کرو خیالِ ''وی سی''، نہ فریبِ ''ڈین کھاؤ''

و تعز من تشاء و تذل من تشاء

ڈاکٹر صاحب بزرگانِ دین خاص طور سے حضرت نظام الدین اولیا سے بے پایاں عقیدت رکھتے تھے اور ان کی زیارت کے لیے ان کی درگاہ میں حاضری دینا عین سعادت سمجھتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو تھا۔ وہ اپنے پیر و مرشد جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے بھی بڑے معتقد تھے۔ ۸۰ء کی دہائی کی بات ہے، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے اعزاز میں ایک تقریب شیرٹن ہوٹل، کراچی میں منعقد ہوئی جس میں ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ مجھے بھی ان کے ایک عقیدت مند، جسٹس نعیم الدین جج، سپریم کورٹ نے بلایا تھا۔ میں سندھ کا محتسب تھا، اس موقعے پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے صوفی بزرگانِ دین اور خاص طور سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ میں بھی ان سے حیدرآباد میں اپنے داماد رضوان میاں کے ہمراہ ملا تھا جو اُس وقت ڈپٹی کمشنر لگے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، ڈاکٹر صاحب! پردہ کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے مختصراً جواب دیا، ''پردہ آنکھوں کا ہوتا ہے۔'' بے شک یہی قرآن میں ہے۔

یہ ۲۰۰۹ء کی بات ہے۔ میں فیڈرل شریعت کورٹ کا چیف جسٹس تھا اور اسلام آباد سے کوئٹہ مقدمے سننے آیا ہوا تھا، عدالتی کارروائی کے دوران ریڈر نے ایک پرچی تھمائی کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کا کراچی سے فون آیا تھا، میں انھیں فون کرلوں۔ چائے کے وقفے میں چیمبر سے میں نے انھیں فون کیا۔ انھوں نے کہا، جسٹس صاحب! ہم ایک جلسہ جناب شاہد احمد دہلوی کی یاد میں کررہے ہیں، آپ اس موقعے پر کچھ لکھ کر بھیج دیں۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب ضرور بھیجوں گا۔ ''ساقی'' میں تو چچا شاہد نے میرا پہلا افسانہ چھاپا تھا۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال تھی۔ ان کے ساتھ تو میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ چند دن بعد مجھ سے جیسا ہو سکا، چچا شاہد پر ایک مختصر سا مضمون لکھ کر روانہ کیا۔

میرے چیف جسٹس بننے سے بہت پہلے کی بات ہے، فیڈرل شریعت کورٹ نے ہر طرح کے سود کو ''رِبا'' قرار دیا۔ فیصلے کو سپریم کورٹ شریعت بنچ نے نظرِ ثانی کے لیے واپس بھیج دیا۔ فیصلے میں ڈپٹی نذیر احمد کا مؤقف کہ بینک کا سود ''رِبا'' کے زمرے میں نہیں آتا، پیش نہیں کیا گیا گوکہ اس کی تائید میں جسٹس قدیر الدین احمد، مشہور ایڈوکیٹ خالد اسحاق اور دوسرے اسکالرز

کو بھی نظر انداز کیا گیا اور اس بات کو بھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا کہ آیا حکومت یا ملکی اور غیر ملکی اداروں کی دسترس میں ہے کہ کسی ملک کی کرنسی کی قدر نہ گھٹنے دے نہ بڑھنے دے۔ قوتِ خرید و فروخت وہی رہے اور کرنسی اپنے مقام پر قائم رہے۔ عرصہ ٔ دراز کے بعد میں نے اس مسئلے پر پیش رفت کرنی چاہی لیکن حکومت کی عدم دل چسپی کی بنا پر یہ مسئلہ برس ہا برس سے اٹکا ہوا ہے۔ میں نے اس کا ذکر ڈاکٹر اسلم فرخی سے کیا کہ شاید ڈپٹی نذیر احمد کی ایسی کوئی تحریر ان کے علم میں ہو، یہ بات میرے کراچی واپس آنے پر ہوئی۔

جب بھی میں ڈاکٹر فرخی کے ہاں جاتا، ہر دفعہ میری نظر ڈرائنگ روم میں لگی ڈپٹی نذیر احمد کی ایک بہت بڑی تصویر پر پڑتی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک دفعہ پوچھا کہ کیا وہ کہیں سے میرے دادا علامہ راشد الخیری کا نامکمل ناول "احسن و میمونہ" حاصل کرسکتے ہیں؟ یہ نامکمل ناول ۹۶-۱۸۹۵ء میں "روہیل کھنڈ گزٹ" میں قسط وار شائع ہوا تھا، جب اُن کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ اس کو پڑھ کر ڈپٹی نذیر احمد نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا جس پر میرے دادا نے نامکمل ناول کی ساری قسطیں جلا ڈالیں۔ ڈاکٹر فرخی نے اس پر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا کہ ایسی کوئی قسط ان کی نظر سے نہیں گزری۔ میرا تجسّس اب بھی اسی طرح برقرار ہے۔ حد یہ ہے کہ میرے والد کی ضخیم اور بقول ڈاکٹر اسلم فرخی اردو کی بے مثال سوانح عمری "علامہ راشد الخیری" میں اس کا تذکرہ تو بے شک ہے لیکن کہیں وہ پڑھنے کے لیے دستیاب نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کا بلا کا حافظہ تھا، اگر وہ تاریخ داں ہوتے تو بڑے نامی گرامی تاریخ داں ہوتے۔ ادب کے میدان میں بھی جہاں جہاں انھوں نے قدم اٹھایا لگتا تھا کہ واقعات اور کردار سامنے سے گزر رہے ہیں۔ انھوں نے متعلقہ ادب میں ایسی تاریخ رقم کی جو اپنی ساری باریکیوں اور گہرائیوں کے ساتھ مستند، معتبر اور دل چسپ بھی ہے۔

ایک دن میری نظر ایک پرانی کتاب "بربط" پر پڑی۔ مصنف تھے آغا اشرف۔ فوراً دھیان محمد حسین آزاد کے پوتے آغا اشرف پر گیا۔ وہ والد کے ملنے والے تھے اور کبھی کبھی گھر بھی آتے۔ کتاب پڑھنی شروع کی تو طرزِ بیان بھی خوب تھا اور کہانی ایک یونانی دیومالا پر مبنی تھی۔ میں نے ڈاکٹر اسلم فرخی کو فون کیا کہ وہ محمد حسین آزاد کے خانوادے سے نہ صرف بخوبی واقف

تھے بلکہ آغا اشرف پہ تو ان کا ایک خاکہ بھی تھا۔ کتاب کی فوٹو اسٹیٹ کروا کر میں نے ڈاکٹر اسلم فرخی کو بھجوا دی اور فون کیا۔ انھوں نے کہا، ان کی نظر سے ایسی کوئی کتاب نہیں گزری۔ بہر حال دیکھ کر بتاؤں گا۔ کچھ دن بعد جب میں ان سے ملنے گیا، انھوں نے کہا یہ کتاب آغا اشرف کی نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ آغا محمد اشرف کے نام سے لکھتے تھے، آغا اشرف کے نام سے نہیں۔ بہر حال انھوں نے کتاب انجمن ترقیِ اردو کے لیے ڈاکٹر فاطمہ حسن کو دے دی لیکن جس بات نے مجھے انتہائی حیرت میں ڈال دیا، وہ یہ تھی کہ انھوں نے کہا کہ حاذق میاں تمھاری بھی تو ایک کہانی یونانی دیومالا پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی سے میری وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہو گیا تھا، جب میں اپنے فرائضِ منصبی سے فارغ ہو کر جون ۲۰۰۹ء میں واپس کراچی آ گیا۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر فرخی کا فون آیا، انھوں نے کہا کہ اب آپ فارغ ہو گئے ہیں، افسانے لکھنے شروع کیجیے۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب اب افسانے کہاں۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے چند روز بعد ان کے دولت خانے پہنچ گیا۔ یہ میری ان سے عرصے دراز کے بعد پہلی ملاقات تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے بیٹھتے ہی کہا کہ ''اب فارغ ہو گئے ہو تو لکھو۔'' میں نے کہا تھا، ڈاکٹر صاحب اب وہ عہد گزر چکا ہے۔ کہنے لگے، اب اس گزرے ہوئے عہد پر ہی لکھو۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ میں نے لکھنے کی کوشش کی لیکن قلم میرا ساتھ ہی نہیں دے رہا تھا، کچھ لکھتا تھا اور پھاڑ دیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا ہر پندرہ بیس دن بعد فون آتا کہ کچھ لکھا؟ میں ہر دفعہ ڈاکٹر اسلم فرخی کو نااُمید کرتا۔ وہ کہتے، نہیں تم لکھ سکتے ہو، تمھارا تعلق ادیبوں کے خاندان سے ہے، تم خود ادیب ہو۔ میں نے جیسا ہوا، لکھنا شروع کیا۔ اپنی چھوٹی بہن صفورا خیری کو دکھایا۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ اپنی بیٹی حنا خیری کو دکھایا، اس نے بھی یہی کہا۔ ڈاکٹر صاحب کا فون آیا تو میں نے کہا کہ سو صفحے ہو گئے ہیں۔ کہنے لگے، میاں یہ کوئی بات نہیں ہوئی، تمھاری یادداشتیں کوئی پانچ سو صفحے کی ہونی چاہییں۔ وہ بتاتے رہے کہ کس طرح یادداشتوں کا دائرہ وسیع کیا جا سکتا ہے کہ بارِ خاطر بھی نہ ہو۔ بہر حال وہ صفحے بڑھتے بڑھتے بہت بڑھ گئے اور پونے تین سو صفحات تک ہو گئے۔ یادداشتوں پر مبنی کتاب ''جاگتے لمحے'' ۲۰۱۲ء میں مکمل ہوئی اور فیروز سنز

نے شائع کی، چھپنے پر بڑی پذیرائی ہوئی۔ دو ایڈیشن نکل گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، ''مزید جاگتے لمحے'' جو گزر رہے ہیں یا کچھ عرصے پہلے گزرے، اُن پر لکھو۔ خیر یہ تو نہیں ہوا لیکن دو سال بعد میرے ڈراموں کا مجموعہ ''وہ آدمی'' شائع ہوا، وہ بھی پسند کیا گیا۔ میری ان دونوں کتابوں کا کریڈٹ مجھے نہیں، پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی کو جاتا ہے۔ میرے قلم کو تو زنگ لگ گیا تھا لیکن انھوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنی جانب کھینچ لیا اور کہا، ''لکھو!!''

ڈاکٹر اسلم فرخی نے زندگی میں بڑی جدوجہد کی، دکھ اٹھائے لیکن خندہ پیشانی سے حوادث کا مقابلہ کیا اور اپنی تمام تر توانائی علم و ادب اور بچوں کی تعلیم اور اخلاق پر صرف کی۔ رزقِ حلال کھایا اور بال بچوں کو کھلایا۔ شریکِ حیات کے ساتھ عزت اور قناعت کی زندگی بسر کی اور ڈاکٹر آصف فرخی جیسے ہونہار لائق سپوت چھوڑ کر رخصت ہوئے۔

مصاحبہ: عنبریں حسیب عنبر

پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی سے گفتگو

عنبر: آپ کی علمی اور دانش ورانہ حیثیت مسلمہ ہے اور آپ نے جس طرح تحقیق، تنقید اور خاکہ نگاری میں انفرادیت قائم کی ہے وہ بھی ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے اور ماشاء اللہ آپ بزرگوں کی صف میں ایک چھتنار درخت کے سایے کی طرح ہیں تو اس لحاظ سے اب تک سیکڑوں بار آپ سے ابتدائی قسم کے ایسے سوالات کیے گئے ہوں گے کہ جن کا جواب دیتے ہوئے شاید آپ کو بے دلی کا شکار ہونا پڑا ہو، لیکن نئی نسل میں ایسے لوگ ہیں اور یقیناً ہمارے ''اسالیب'' کے قارئین بھی، جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کہاں پیدا ہوئے؟ گھریلو اور خاندانی ماحول کیا تھا؟ ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟ آپ کا اپنا معاشرتی ماحول کیسا تھا؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میں ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو لکھنؤ کے محلے سبحان نگر میں پیدا ہوا۔ یہاں میرے نانا کا مکان تھا۔ ہوا یہ کہ میرے نانا کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی صرف تین بیٹیاں تھیں تو انھوں نے مجھے گود لے لیا اور میری ابتدائی پرورش لکھنؤ میں ہوئی۔ میرے نانا کتابیں شائع کرنے کا کاروبار کرتے تھے اور ان کے والد بھی یہی کاروبار کرتے تھے۔ ان کا باقاعدہ پریس تھا جہاں سے کتابیں چھپتی تھیں۔ چناں چہ ان کی بعض کتابیں بڑی مقبول ہوئیں، مثلاً یہ کہ داغؔ کے دو دیوان ''گلزارِ داغ'' اور ''آفتابِ داغ'' اور پھر مثنوی ''فریادِ داغ'' کے حقوق ہمارے پَرنانا کے پاس تھے اور وہ ان کتابوں کو چھاپتے تھے۔ یہ بڑے فخر کی بات تھی، داغؔ کا کلام بڑا مقبول تھا۔ اس کے علاوہ بعض اور کتابیں شائع کیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں سے ایک کتاب ''اسلام کھنڈ'' بھی تھی۔ یہ کتاب میرے پاس نہیں تھی، مرحوم دوست نذرالحسن صدیقی نے یہ کتاب مجھے تحفتاً عطا کر دی تھی جس میں عہدِ رسالت کے غزوات کا موضوع انھوں نے سامنے رکھا تھا، تو جاڑوں کی رات میں لوگ جمع ہوتے تھے، بیٹھتے تھے اور وہ پڑھی جاتی تھی۔ یہ کتاب بہت مقبول تھی اور بہت چھپتی تھی۔ اس طرح گویا بچپن ہی سے کتابوں اور کتابوں کو شائع کرنے والوں سے قربت حاصل

ہوئی۔ نانا کو عرسوں میں جانے کا شوق تھا۔ میں جب ذرا بڑا ہوا تو وہ جب کسی عرس میں جاتے تھے تو مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ حالاں کہ میری نانی اور خالہ منع کرتی تھیں کہ بچے کو ساتھ مت لے جاؤ مگر وہ مجھے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ یہاں میں نے ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ جیسے ہوتا ہے کہ مسلمان بچے پڑھتے ہیں میں نے بھی تشریح الحروف سے ابتدا کی، کریمہ پڑھا، گلستاں پڑھی، بوستاں پڑھی، فارسی کی بعض اور کتابیں پڑھیں۔ گلستاں اور بوستاں کا بڑا حصہ مجھے زبانی بھی یاد ہو گیا اور کچھ اب بھی یاد ہے۔ پھر میرے والد مجھے فتح گڑھ لے آئے جو ہمارا وطن تھا۔ یہاں میں گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہاں کا ماحول بالکل دوسرا تھا۔ میرے والد گورنمنٹ اسکول میں ماسٹر رہ چکے تھے تو یہاں پڑھنے پڑھانے کا زور زیادہ تھا۔ ننھیال میں شعر و شاعری اور کتابوں کی اشاعت کا زور تھا جب کہ یہاں کتابوں کی اشاعت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ یہاں یہ تھا کہ خاندان میں جتنے بھی تھے وہ سب شاعر — پردادا بھی شاعر تھے، پھر دادا بھی شاعر تھے، والد بھی شاعر تھے اور مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مشاعروں میں قصبے کے سارے شاعر اور شعر و سخن سے دل چسپی رکھنے والے شریک ہوتے تھے، بلکہ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ میں چھوٹا تھا تو میرے یہاں مشاعرے میں ایک ہندو شاعر آئے تو وہ دھوتی باندھے اور کُرتا پہنے ہوئے تھے، انھوں نے جو غزل پڑھی اس میں ایک مصرع تھا کہ ''بیٹھے ہیں عید گاہ میں ہم سر لیے ہوئے'' تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ تو ہندو ہیں یہ عید گاہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ دادا یعنی ابا میاں سے پوچھتا، جو مولوی صاحب ہمیں پڑھاتے تھے اُن سے بھی پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور بھائی جان یعنی والد سے پوچھنے کی تو بالکل ہی ہمت نہیں ہوئی۔ میں سوچتا رہا پھر میں نے اپنی والدہ سے پوچھا۔ وہ تو لکھنؤ کی تھیں اور ان کا شعر و سخن کا ذوق بھی بہت عمدہ تھا، وہ اسکول کی پڑھی ہوئی تھیں۔ ان سے پوچھا تو کہنے لگیں کہ شاعری میں بھی اور ادب میں بھی ہندو، مسلم نہیں ہوتا۔ یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی اور میں نے اس بات کا مطلب یہ نکالا کہ وہ یہ بتانا چاہتی تھیں کہ ادب میں مذہب کی تفریق نہیں ہے اور اسی بات پر سارے شاعروں اور ادیبوں کا اتفاق ہے۔ اردو زبان میں بھی جو شاعر ہیں ان کے ہاں بھی یہی کہا گیا ہے۔ تو میں وہاں پڑھتا رہا اور تعلیم جاری رہی مگر یہ کہ مجھے اپنے گھر کے افراد کو دیکھ کر شعر

کہنے کا شوق ہو گیا۔ میری ایک بہن تھیں، وہ چشمؔ تخلص کرتی تھیں اور بہت اچھی شاعرہ تھیں، اسی طرح میرے پھوپھی زاد بھائی تھے وہ مستند شاعر تھے، وفا فرخ آبادی صاحب۔ میں نے ان کا خاکہ بھی لکھا ہے۔

عنبر: بہت عمدہ خاکہ ہے، غالباً ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' میں شامل ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: جی ہاں۔ افسوس یہ ہے کہ وہ جوان مر گئے اور ان کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ ان کا جو کچھ کلام ان کے چھوٹے بھائی کو یاد تھا یا کچھ مجھ تک اور خاندان کے دوسرے افراد تک پہنچا، وہ شائع نہیں ہوا۔ وہ جگرؔ صاحب کے شاگرد تھے اور اچھے شعر کہتے تھے۔ جیسے غالبؔ کی زمین میں مشاعرہ ہوا تھا کہ:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

تو اس غزل میں غالبؔ کا شعر بڑا اچھا ہے کہ:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اب انھوں نے جو طرحی غزل پڑھی اس میں یہ شعر بڑا خوب صورت تھا کہ:

مرے ہی خون سے رنگینیِ جہاں قائم
مجھی سے پوچھ رہے ہو، ترا لہو کیا ہے

عنبر: سبحان اللہ! واقعی بہت خوب صورت شعر ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ ان کے مزاج میں تلون تھا، کبھی لاہور میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے ساتھ ہیں اور انھوں نے ''ادبی دُنیا'' نامی رسالا نکالا تو وہ اس میں کام کر رہے ہیں۔ پھر انڈیا آ گئے، آل انڈیا ریڈیو میں کام کرنے لگے، جوشؔ صاحب کے رسالے ''کلیم'' میں کام کیا۔ مگر وہ بے چارے اچانک وفات پا گئے۔ اسی طرح گھر میں والد بھی شاعر تھے اور انھوں نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا مگر شائع وہ بھی نہیں ہوا۔ میرے والد گورنمنٹ اسکول میں استاد تھے مگر ہوا یہ کہ جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ترکِ موالات کا دور آیا کہ انگریز کی نوکری نہیں کریں گے تو انھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ مگر سارا شہر ان کو ماسٹر صاحب

کہتا تھا، تو وہ بھی شاعر تھے۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے کہ مجھے بے انتہا اشعار یاد ہیں، اردو کے بھی اور فارسی کے بھی اور میں نے اس معاملے میں کسی شخص سے بھی شکست نہیں کھائی، لیکن میرے والد کو مجھ سے بہت زیادہ شعر یاد تھے اور میں کبھی ان کے سامنے بھولے سے بھی شعر نہیں پڑھتا تھا۔ اس لیے نہیں پڑھتا تھا کہ اگر میں نے شعر پڑھا تو وہ اس کے جواب میں دس شعر پڑھیں گے۔

عنبر: کیا کہنے ہیں! سبحان اللہ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: جی ہاں! اور میں حیرت سے ان کو دیکھتا رہتا تھا۔ ان سے ملنے والے جیسے شبیر علی کاظمی مرحوم، جو اردو کے بڑے پرانے استاد تھے، اور شعبۂ اردو کے ڈاکٹر شاہ علی سب یہی کہتے تھے کہ بھئی ہم نے تو ایسا آدمی نہیں دیکھا کہ شعر پہ شعر یاد ہیں۔ تو یہ وجہ تھی کہ میں اُن کے سامنے شعر نہیں پڑھتا تھا مگر گھر میں باقی سب کو میں شعر سناتا تھا۔ ابوالقاسم بھائی فرخ آباد آجاتے تھے تو انھیں بھی شعر سناتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ سنہ ۴۱ء میں، میں نے ایک نظم لکھی۔ میرے یہاں ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس میں ایک عربی دوشیزہ کھڑکی سے جھانک رہی تھی اور نیچے ایک عرب کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس عربی لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شوخی تھی۔ میں وہ تصویر برابر دیکھتا تھا اور پھر میں نے نظم کہی کہ:

اک ہنسی ہونٹوں پہ اور نیچی نگاہیں یاد ہیں

والد صاحب قبلہ نے اتفاق سے وہ نظم دیکھ لی اور آپا سے کہا کہ لیجیے مبارک ہو، آپ کے صاحب زادے عاشقانہ نظمیں کہنے لگے ہیں۔ وہ کہنے لگیں تو اور کیا کہہ سکتا ہے؟ نظم ہے، نظم رکھی ہوئی ہے، پڑھ لیجیے۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، لیکن پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ کریں، یہ شعر و شاعری کوئی کام کی چیز نہیں۔ خیر، تو میں اُن سے چھپا کے شعر کہتا رہا۔ والد نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا، میں اُن کے بغیر مشاعروں میں جانے لگا تھا اور شعر بہت ٹھیک کہتا تھا تو بعض نوجوان ایسے تھے جو میرے پاس آتے تھے اور مشاعرے کی غزل مجھ سے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ مجھے افسوس یہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی غزلوں کی تعریف اور زیادہ ہوتی تھی اور میری غزل کی تعریف کم ہوتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ذرا تنومند تھے، مضبوط تھے۔ تو یوں یہ سلسلہ ہوتا رہا۔

ہمارے ہاں گورنمنٹ ہائی اسکولز میں پہلے فتح گڑھ آتا تھا۔ پھر فرخ آباد آتا تھا اور دونوں میں تقاریب کے سلسلے میں مسابقت تھی، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ فرخ آباد میں مشاعرہ ہوا۔ گورنمنٹ اسکول اور سارے تعلیمی ادارے اس مشاعرے میں مدعو تھے۔ اب اطلاع یہ ملی کہ فرخ آباد گورنمنٹ اسکول کے طالب علموں نے یہ طے کیا ہے کہ فتح گڑھ گورنمنٹ اسکول کے طالب علموں کو پڑھنے نہیں دیں گے۔ اب ہم لوگ گروہ کی شکل میں بیٹھے تھے۔ پہلے انھوں نے پڑھا تو خوب داد ملی اور تالیاں بجیں۔ جب ہمارا نمبر آیا تو غُل غپاڑہ ہونے لگا۔ کوئی کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھا تو میں نے بیٹھے بیٹھے چار مصرعے لکھ دیے اور یہ کہا کہ چار مصرعے پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے:

فرخ آباد میں اشعار سنانے آکر
اپنی آواز پہ پابندیِ پیہم دیکھی
ہر طرف شور کہ چپکے رہو، خاموش رہو
مائلِ شور و شغف محفلِ برہم دیکھی

تو یہ مصرعے کیا پڑھے کہ مجمعے کو سانپ سونگھ گیا اور سب خاموش ہوگئے۔ کسی نے کوئی ہوٹنگ نہیں کی اور میں نے انتہائی ترقی پسندانہ نظم پڑھی اور نہایت کامیابی کے ساتھ پڑھ کر آگیا۔ وہاں فتح گڑھ کے جو شاعر تھے انھوں نے کہا کہ بھئی تمھیں تو داد مل گئی، سب نے بہت تعریف کی اور کچھ دن بعد سینئر شعرا کو بھی سنائی۔ اس طرح میں پڑھتا رہا، شعر کہتا رہا اور پڑھتا رہا۔ نظم کہنے کا شوق ہوا، افسانے لکھنے کا شوق ہوا تو نظمیں اور افسانے شائع ہوتے رہے۔ پھر ترقی پسند تحریک کا دورِ عروج تھا تو بہت نظمیں لکھیں۔ ان میں سے بعض یاد ہیں اور بہت سی بھول گیا ہوں۔ ۴۶ء میں، میں نے ایک نظم لکھی تھی جو مجھے اب تک یاد بھی ہے اور پسند بھی ہے:

تیری آغوش ہے گہوارۂ امیدِ حیات
تو نے اے جانِ تمنا یہ سنا بھی کہ نہیں
تیری فردوس سے تابندہ ہے یزداں کا جمال
تیرے رخسار سے دمکی ہوئی تاروں کی جبیں

تو نے اے جانِ تمنا یہ سنا بھی کہ نہیں
مجھے کھینچے لیے جاتا ہے فرائض کا خیال
مطمئن ہوں کہ نہیں تابِ نشاطِ آغوش
زندگی غم کے سیہ خانے میں گزرے گی مگر
تیری قربت کے تصور سے رہوں گا مدہوش
تو نے اے جانِ تمنا یہ سنا بھی کہ نہیں
تیرا اصرار ، تری ضد ، تری نازک خفگی
آنکھ میں اُمڈے ہوئے اشک ، جبیں پر لہریں
کون جانے مری اس لغزشِ پا کے اسرار
وقت آ پہنچا ہے اے دوست کہ رخصت ہو لیں
تو نے اے جانِ تمنا یہ سنا بھی کہ نہیں

تو اس طرح بہت سی نظمیں لکھیں۔ تقریباً روزانہ نظم لکھتا تھا اور بہت سی نظمیں شائع بھی ہوئیں۔ پھر جناب یہ سلسلہ یوں ٹوٹا کہ تحریکِ پاکستان عروج پر آگئی اور چوں کہ قصبے میں مسلمانوں میں زیادہ تعداد سرکاری ملازمین کی تھی تو وہ کھل کر تو کام کر نہیں سکتے تھے، لہٰذا مجھے قصبے کی مسلم لیگ کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔ اور اس زمانے میں ترقی پسند تحریک حمایت کر رہی تھی تحریکِ پاکستان کی۔ یہ سلسلہ چلنے لگا، دورے ہونے لگے کہ یہاں جا رہے ہیں، وہاں جا رہے ہیں، پھر الیکشن کا زمانہ آگیا تو بڑے ولولے کے ساتھ جھنڈے لیے گھوم رہا ہوں۔ اب سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ سارا دور کیسے گزرا۔

عنبر: پاکستان کی جدوجہدِ آزادی کو اس عمر میں آپ نے کس کس رُخ سے دیکھا؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میں نے ایک کارکن اور ایک مجاہد کی حیثیت سے دیکھا کیوں کہ میں تو خود اس میں شریک تھا۔ تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ مسلمانوں سے کہتا تھا کہ مسلم لیگ تمھاری جماعت ہے، تحریکِ پاکستان میں حصہ لو، پاکستان کو ووٹ دو۔ پھر الیکشن ہوا صوبائی اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کا تو بڑا جوش و خروش تھا سب میں۔ یوپی میں صوبائی اسمبلی میں غالباً دو امیدوار کانگریس کے کامیاب

ہوئے تھے، باقی سب مسلم لیگ کے تھے اور جو مرکزی اسمبلی تھی اس میں تمام امیدوار مسلم لیگ کے کامیاب ہوئے تھے۔ وہ ایک غیر معمولی جوش وخروش تھا اور کسی کو کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ بس یہی تھا کہ پاکستان بن جائے گا تو مسلمانوں کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ پاکستان قائم ہونے کے فوراً بعد میں نے محسوس کیا کہ قصبے کا ماحول بدل گیا ہے اور وہ جو دوست تھے وہ عجیب طرح ملنے لگے ہیں تو میں اُس زمانے میں بمبئی چلا گیا اور وہاں سے کراچی آ گیا۔

عنبر: آپ کس سن میں پاکستان تشریف لائے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میں ۵؍ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی آیا تھا۔ یعنی لوگوں کی عمر اتنی نہیں ہو گی جتنا وقت مجھے کراچی میں رہتے ہوئے ہو گیا ہے۔ میں یہاں پانی کے جہاز سے آیا تھا اور یہاں سارے کراچی کو پیدل گھوم کر دیکھا۔

عنبر: ماشاء اللہ۔ اُس وقت کا کراچی کیسا تھا ڈاکٹر صاحب؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: کراچی بہت نفیس، بہت ستھرا، بہت اچھا شہر تھا۔ سڑکیں صبح چار بجے صابن سے دھوئی جاتی تھیں۔ اور مکانات سب اچھے بنے ہوئے، سڑکیں بھی صاف ستھری تھیں۔ ٹرامیں اور بسیں بھی بہت اچھی اور بہت ستھری تھیں۔ ایک آنے میں صدر سے بولٹن مارکیٹ آجاتے تھے۔ ایک آنے میں بولٹن مارکیٹ سے گاندھی گارڈن آجاتے تھے، چاکیواڑے چلے جاتے تھے۔

صدر سے ۲۰ پیسے میں کینٹ اسٹیشن چلے گئے، سولجر بازار آجاتے تھے اور آرام سے آیئے جایئے۔ دکانیں خالی تھیں کیوں کہ جو ہندو کاروبار کرنے والے تھے وہ زیادہ تر ہندوستان جا چکے تھے۔ پھر اس کے بعد آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا اور شہر میں مکانات کی قلت ہونے لگی۔ ایک ایک کمرے میں بیس بیس آدمی رہتے تھے تو جناب یہاں سے پھر وہی شعر و سخن کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک اخبار ''میثاق'' کے نام سے نکلتا تھا اور سندھ مدرسے کے سامنے اس کا دفتر تھا۔ مجید لاہوری اس میں کالم لکھتے تھے۔ ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں، شام کو وہاں بیٹھک ہوتی تھی اور جب ''جنگ'' شائع ہونے لگا تو شام کو وہاں رئیس بھائی بیٹھا کرتے تھے اور بہت سے شاعر وہاں جمع ہوتے تھے اور ترقی پسند مصنّفین کے جلسے بھی وہیں ایک ریسٹورنٹ ''کوالٹی'' میں ہوتے تھے مگر پھر ہوٹل والوں نے جلسہ کرنے سے منع کر دیا تو پھر برنس گارڈن میں جلسے ہونے لگے لیکن جب

حکومت نے پابندی عائد کر دی تو وہ سارا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں اور کوئی ذریعہ ملنے جلنے کا نہیں تھا تو پھر رئیس بھائی کے ہاں جمع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں روز یہ ہوتا تھا کہ آج جیکب لائن میں مشاعرہ ہو رہا ہے، آج ماری پور میں مشاعرہ ہے، آج برنس روڈ میں مشاعرہ ہے۔ مشاعرہ کیا ہوتا تھا، بس سب جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ پھر میں ریڈیو میں ملازم ہو گیا اور آٹھ برس شعبۂ موسیقی سے وابستہ رہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی موسیقار تھا یا گویا تھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شعبۂ موسیقی میں میرے ذمے یہ کام تھا کہ نمبر ایک، میں اساتذہ کا کلام پڑھ کر گانے کے لیے کلام کا انتخاب کرتا تھا، نمبر دو یہ کہ جو گانے والے اور گانے والیاں تھیں ان کے تلفظ صحیح کرتا تھا اور نمبر تین یہ کہ غنایئے لکھتا تھا، فیچر لکھتا تھا اور کہانیاں لکھتا تھا تو وہ بڑا دلچسپ اور ذہن کو وسعت دینے والا زمانہ تھا کیوں کہ مجھے اس دور میں اردو کے سارے اساتذہ کا کلام توجہ سے پڑھنے کا موقع ملا، اقبالؔ کا سارا کلام پڑھا اور مجھے اقبال اور بیش تر شعرا کا سارا کلام یاد ہو گیا، اب تک یاد ہے مگر ہاں اب یہ ہے کہ مصرع یاد آتا ہے تو غزل کے کچھ شعر یاد آتے ہیں۔

عنبر: ڈاکٹر صاحب! جب آپ ریڈیو میں ملازمت کر رہے تھے تو اس زمانے میں اور کون کون سی شخصیات وہاں تھیں اور کیسی شخصیات تھیں؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: اس زمانے میں جو ہمارے موسیقی کے نگراں تھے وہ شاہد احمد دہلوی تھے۔ وہ نہ صرف بڑے ادیب تھے بلکہ بڑے موسیقار بھی تھے۔ ان کے علاوہ اس وقت ریڈیو میں شعبۂ موسیقی میں قاری عباس، ارم لکھنوی، وجد چغتائی اور شمس زبیری تھے۔ اب آگے بڑھیے تو اس کمرے میں صادقین بیٹھے ہیں، اس کمرے میں سلیم احمد بیٹھے ہوئے ہیں، اس کمرے میں مدنی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، برابر کے کمرے میں حمید نسیم صاحب بیٹھے ہیں۔ اس کمرے میں شعیب حزیں امروہوی بیٹھے ہیں اور ہر ایک کے یہاں ایک محفل آراستہ رہتی تھی اور جناب علمی بحثیں ہو رہی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ سبھی ایک کمرے میں بیٹھے ہیں اور زور و شور کی گفتگو ہو رہی ہے۔ اب آگے بڑھیے تو پھر ریڈیو کے مستقل ملازمین ہیں، یہاں شمس الدین بٹ صاحب بیٹھے ہیں، یہاں سعید الظفر بیٹھے ہیں، یہاں خالد لطیف بیٹھے ہیں تو اس طرح ایک سے ایک اچھا آدمی،

ایک سے ایک اُبھرتا ہوا فن کار اور سب ایک دوسرے کے گہرے دوست اور سب کے سب ایک دوسرے کے مقابلے پر رہتے تھے مگر غلط یا منفی طریقے سے نہیں۔

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ شہر میں فری اسٹائل کشتیوں کا انعقاد ہوا اور باہر سے پہلوان آئے تو بخاری صاحب نے کہا کہ سلیم احمد اور تم گاما کے اکھاڑے میں جاؤ اور اس کا اور اس کے پٹھوں کا انٹرویو کر لو اور فیچر لکھ لو۔ اب ہم دونوں گئے تو اوّل تو وہ جو پہلوان تھے وہ ہمیں دیکھ کر ہنسنے لگے کیوں کہ ہماری کلائیاں اُن سے آدھی تھیں مگر گاما بڑا شریف آدمی تھا، اُس نے انھیں ڈانٹا اور کہا کہ یہ قلم کے ہاتھ ہیں ان کی عزت کرو، تو صاحب پھر بڑی خاطر تواضع ہوئی۔

ایک مرتبہ سلیم احمد نے کہا کہ ایسے فیچر لکھا جائے کہ شروع کا آدھا حصہ تم لکھو اور بعد کا آدھا حصہ ہم لکھیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے تو ایسے لکھا اور وہ براڈکاسٹ بھی ہوا۔ تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مقابلے میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ اور ایسا ہوا کہ بخاری صاحب نے کہا کہ اب فیچر روزانہ نشر ہوا کرے گا اور اسلم فرخی، سلیم احمد اور افضل صدیقی مل کر فیچر لکھیں گے۔ سلیم احمد کہنے لگے کہ ہم تو دیر میں سو کر اٹھتے ہیں اور دیر سے آتے ہیں، تم اور افضل آفس کے آدمی ہو، لہٰذا تم شروع کا حصہ لکھ دیا کرو، افضل اس کا درمیانی حصہ لکھ دیا کرے اور میں جب آؤں گا تو میں اس کا خاتمہ کر دیا کروں گا۔ اس طرح بہت دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ یہ کیسی ملی بھگت ہے اور کس طرح فیچر لکھا جا رہا ہے کہ شروع میں نے کیا، درمیان میں افضل نے پہنچایا اور سلیم احمد نے اختتام کیا۔ تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہمارا تربیتی دور تھا۔ اس کے بعد ادب، شعر اور زندگی کے مسائل، ملک کے مسائل اور عالمی ادب پر بحثیں ہوتیں۔ مدنی صاحب بھئی کیا آدمی تھے، کیا معلومات تھیں ان کی اور کیا ان کی شاعری اور کیا لہجہ تھا اُن کا:

فراق سے بھی گئے ہم، وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیشِ ملال سے بھی گئے
چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خدوخال سے بھی گئے

اور اس میں یہ شعر بھی ہے کہ:

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

عنبر: سبحان اللہ، سبحان اللہ! کیا کہنے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: کسی دوسرے شاعر کے ہاں یہ لہجہ نہیں — تو ہوتا یوں تھا کہ جناب بیٹھے ہوئے ہیں، قمیص پھٹی ہوئی ہے، کوئی بات نہیں۔ چائے پی رہے ہیں، بات کر رہے ہیں۔ نہایت لائق آدمی اور شعر وادب میں ڈوبے ہوئے آدمی تھے مدنی صاحب اور ان کا بڑا وسیع مطالعہ تھا، انگریزی ادب پر بڑی گہری نظر تھی ان کی۔ ایک اور صاحب شمس الدین بٹ تھے، وہ جانتے تھے کہ ڈراما اور خصوصاً ریڈیو کے لیے ڈراما کیسے لکھا جاتا ہے۔ انھوں نے امریکا سے ڈراما پروڈکشن میں ماسٹرز کیا تھا اور وہ بادشاہ تھے ڈرامے کے۔ انھوں نے ایسے ایسے ڈرامے لکھے اور ایسے ایسے لوگوں کو ڈراما لکھنا سکھایا اور ایسے ایسے صداکاروں کو تربیت دی کہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

اچھا ریڈیو کے حوالے سے یاد آیا کہ ایک دفعہ بخاری صاحب ایس ایم سلیم سے ناراض ہو گئے۔ ایس ایم سلیم ڈرامے کا بڑا مقبول صداکار تھا۔ اس کی آواز کے لوگ منتظر رہتے تھے۔ وہ بے چارہ بڑا پریشان ہوا کہ کیا کرے۔ بڑی کوشش کی اُس نے بات ختم کرنے کی۔ اِس سے کہا اُس سے کہا مگر بخاری صاحب مانے ہی نہیں اور سلیم کی بے کاری کو ایک برس گزر گیا۔ اب جشنِ تمثیل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں پہلا یا دوسرا ایک ڈراما "طوفان کے بعد" میرا بھی تھا۔ اُس ڈرامے کو نشر ہونے سے کچھ عرصے پہلے ایس ایم سلیم کو ملازمت پر بحال کر دیا گیا مگر اس کو نشر کرتے وقت بٹ صاحب نے طے کیا کہ طوفان کے بعد یہ ہیرو کے طور پر آئے گا اور اس کی آواز اچانک آئے گی۔ اب وہ ڈراما ہوا اور ہر شخص پوچھتا کہ سلیم صاحب آگئے؟ سلیم صاحب بحال ہو گئے؟ سلیم صاحب اور بھی ڈرامے کریں گے؟ کیا عمدہ آواز ہے، کیسا ڈراما کر رہے ہیں۔ تو اُس وقت احساس ہوا کہ یہ کتنا بڑا فن کار ہے۔ اسی طرح اور بہت سے لوگ تھے جو ڈرامے سے وابستہ تھے، لکھتے بھی تھے اور ڈراما کرتے بھی تھے۔ کچھ کے نام میں نے لیے اور کئی نام اور بھی تھے جو یاد نہیں۔

بہرحال ہر شعبہ اپنی جگہ بے مثال تھا۔ شعبۂ موسیقی میں ملک کے بڑے گانے والے، بڑے موسیقار تھے۔ ان میں خواتین بھی گاتی تھیں اور مرد بھی گاتے تھے، اصلاح کی جاتی تھی اور میوزک کا پروگرام اس زمانے میں وقت کے لحاظ سے سب سے بڑا پروگرام ہوتا تھا۔

عنبر: ڈاکٹر صاحب! آج جب ہم ریڈیو سنتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں اور ٹی وی دیکھتے ہیں تو ایک بات کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے کہ اب تربیت اور اصلاح کا کوئی شعبہ یہاں موجود نہیں۔ تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس پر روشنی ڈالیے کہ اصلاح یا تربیت کرنے والے نہیں رہے یا ان اداروں میں اب اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی اور ان چیزوں کی وقعت اور اہمیت ختم ہو گئی ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: آج اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جا رہی۔ بخاری صاحب کے زمانے میں صحیح زبان نشر ہونے کا یہ اہتمام تھا کہ گانے والے کے لیے یہ طے ہوا کہ فلاں فلاں غزلیں گائیں گے اور وہ غزلیں نقل کر کے دے دی جاتی تھیں۔ اب وہ براڈکاسٹنگ سے پہلے آئے اور آنے کے بعد شعبۂ موسیقی میں details چیک کرائیں اور details چیک کرانے کے بعد وہ ہم میں سے کسی کے پاس بیٹھے اور اس کو وہ غزلیں یا وہ کلام سنایا اور ہم تصحیح کرتے رہتے تھے کہ یہ لفظ یوں نہیں یوں ہے۔ بخاری صاحب کا حکم یہ تھا کہ اگر کوئی گانے والا کوئی شعر غلط گائے یا کوئی لفظ اگر غلط ادا کرے تو مائیکروفون پر اس کو دُرست کر دیں اور یہ اکثر ہوتا تھا کہ گانے والے نے کچھ غلط گا دیا یا کبھی کچھ کا کچھ گا دیا یا پڑھ دیا تو ایک آدمی وہاں اصلاح کے لیے موجود ہے اور یہ لوگ پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ بخاری صاحب سخت خفا ہوتے تھے کہ اگر کسی نے غلط گایا یا پڑھا اور یہاں سے اس کی تصحیح نہ ہوئی ہوتی۔ اب وہ دور ختم ہو گیا ہے۔ زبان سے بے اعتنائی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب یہ ہے کہ آپ ٹی وی پر دیکھ لیں تو تلفظ بھی غلط ہے اور زبان بھی غلط۔ تصحیح کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ افسوس کریں اور خاموش ہو جائیں، اگر شکایت کریں تو جواب ملتا ہے بھئی کیا کریں بس یہی ہے، یہی لکھا ہوا ہے۔ دیکھیے، جس طرح زندگی کے ہر شعبے میں ہم بے احتیاط ہو گئے ہیں اسی طرح نشریات کے شعبے میں بھی بے احتیاط ہو گئے ہیں۔ بہت مایوسی کی بات یہ ہے کہ اردو کے ایک بڑے اخبار میں ایک نظم چھپی، وہ پوری نہیں تھی، چند سطریں تھیں تو کسی نے کہا کہ سنا دوں؟

تو میں نے کہا کہ ہاں سنادو۔ اب وہ پڑھنے لگے تو میں نے سنانے والے سے کہا کہ یہ غلط ہے صحیح پڑھا کرو تو اُس نے کہا کہ لیجیے دیکھ لیجیے، یہی چھپا ہوا ہے۔ اس کے چار پانچ دن کے بعد ایک اور نظم ایسی چھپی تو بھائی، کیا وہاں کوئی ایسا پڑھا لکھا شخص نہیں ہے جو شائع ہونے والے مواد پر ایک نظر ڈال لے اور یہ فیصلہ کر سکے کہ یہ مواد چھپنے کے قابل ہے اور یہ نہیں ہے۔ کیوں کہ لوگ وہ پڑھ رہے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ اسے درست سمجھ کر سیکھ رہے ہیں کہ چھپا ہوا ہے اور مستند اخبار میں چھپا ہوا ہے تو یہ صحیح ہے۔ یہ بہت عام ہو رہا ہے لیکن کیا کریں کہ اصلاح کے بغیر تو یہ ہو گا کیوں کہ لکھنے والا تو اب خود کو عام طور پر علامہ اور فاضل سمجھتا ہے کہ جو میں نے لکھ دیا ہے وہ پتھر پر لکیر ہے، تو آپ کے سوال کا جواب یہی ہے کہ اگر زبان کی، ادب کی ترویج واشاعت مقصود ہے تو اس کی صحت کا بھی اہتمام کیجیے اور اگر نہیں ہے تو پھر ٹھیک ہے جو ہو سو ہو۔

عنبر: کتابوں کی اشاعت میں پروف ریڈنگ کیوں کی جاتی تھی؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: بھئی اس لیے کی جاتی تھی کہ کتاب صحیح چھپے۔ اب یہ ہے کہ کمپیوٹر کا دور آگیا ہے تو وہ جو ٹائپ کرنے والے اور تصحیح کرنے والے ہوتے ہیں، وہ بے چارے کم علم لوگ ہوتے ہیں۔ وہ لفظ پڑھ نہیں پاتے ہیں بس کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے رہتے ہیں۔ اب جب کتاب چھپ کر آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت ساری غلطیاں رہ گئی ہیں۔ پچھلے زمانے میں جو کتابت کی تصحیح کرتے تھے وہ اپنے فن میں کامل ہوتے تھے۔ اگر آپ نول کشور کے یہاں سے چھپی ہوئی کتاب پڑھیں تو آپ کو معلوم یہ ہو گا کہ جس شخص نے تصحیح کی ہے وہ بہت بڑا آدمی ہے اور آپ کو کتاب میں غلطیاں نہیں ملیں گی۔ تو یہ اہتمام ہوتا تھا کتابوں کی اشاعت میں، اور دوسرا اہتمام یہ ہوتا تھا کہ اگر غلطیاں ہوتی تھیں تو اغلاط نامہ لگا دیا کرتے تھے۔ سبب زبان اور ادب کی صحت کا خیال تھا جواب نہیں۔

عنبر: بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ یقیناً یہ بے حد افسوس ناک صورتِ حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے پی ایچ ڈی کے لیے محمد حسین آزاد کا انتخاب کیوں فرمایا؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے محمد حسین آزاد بہت پسند تھے۔ میرے یہاں میرے والد کا کتب خانہ بہت بڑا تھا۔ وہ اصل میں والد کا کتب خانہ نہیں تھا، بلکہ دادا اور پردادا کا

کتب خانہ تھا اور جو آیا وہ اس میں اضافہ کرتا گیا، تو میں گاہے گاہے والد کی نظر بچا کر وہاں سے کوئی کتاب نکال لیتا تھا اور پڑھتا تھا، تو میں نے ''آبِ حیات'' پڑھی کچھ سمجھ میں آئی کچھ سمجھ میں نہیں آئی مگر آزاد کا طرزِ نگارش اور ان کے بیان کا سلوب بے حد پسند آیا۔ ایک دفعہ گھر میں آتش کا کچھ ذکر ہو رہا تھا، میں بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا تو میں نے کہا کہ اُن کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور خوش بو پھیل گئی۔

والد نے کہا کہ ''کیا تم نے 'آبِ حیات' پڑھی ہے؟''

جواب دیا کہ ''پڑھی ہے۔''

پوچھا، ''کہاں سے لائے؟''

میں نے کہا کہ ''آپ ہی کی کتابوں میں سے لی تھی۔''

انھوں نے کہا، ''اچھا! پڑھتے رہو۔''

پھر ''نیرنگِ خیال'' بھی اس کے ساتھ پڑھی۔ وہ بھی بہت پسند آئی اور محمد حسین آزاد میرے بہت محبوب نثر نگار رہے۔ اب جب پی ایچ ڈی کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس موضوع پر کام کیا جائے تو پہلا نام جو ذہن میں آیا وہ انھیں کا تھا کہ محمد حسین آزاد پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا ہے تو کیوں نہ ان پر کام کیا جائے، اس لیے کام کا آغاز کیا۔

عنبر: آپ نے تو محمد حسین آزاد پر جو کام کیا ہے وہ یقیناً ایک گراں قدر کارنامہ ہے اور آزاد شناسی کا کوئی ذکر آپ کے اس کارنامے کے حوالے کے بغیر اب ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ نے آزاد کو بطور شخصیت کیسا پایا؟ کیوں کہ ان کے بارے میں متضاد آرا ملتی ہیں؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: متضاد آرا تو ملیں گی۔ بات یہ ہے کہ مسابقت کا جذبہ تو آج بھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آزاد طرزِ نو کے مبلغ بھی ہیں اور انھوں نے نئی طرز کی نظمیں لکھیں اور نئی طرز کے مشاعروں کا انعقاد بھی کیا تو جو پرانے شاعر تھے، وہ اُن سے بہت ناراض ہو گئے اور اُن کے خلاف ہو گئے لیکن آزاد اردو میں نظم نگاری کے بنیادی اراکین میں شمار ہوتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی بڑی بد قسمتی ہے کہ جب کوئی آگے بڑھتا ہے تو لوگ اسے نیچے گھسیٹتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے جتنے بھی بڑے شاعر، مصور، موسیقار اور دوسرے لوگ ہیں، ان سب

کو نیچا دکھانے کی ہر زمانے میں کوشش کی جاتی ہے، آزاد بھی اپنے زمانے میں اس کا شکار ہوئے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کی ابتدا کرتا ہے، مثلاً یہ کہ آزاد نے ''آبِ حیات'' لکھی، ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ایسے کتب خانے نہیں تھے کہ آپ جایئے اور جا کر فلاں کتب نکال لیجیے اور لکھ لیجیے۔ لہٰذا سنی ہوئی باتوں، اساتذہ کے خیالات پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔ شعرا کے تذکرے تھے تو ان کا تحقیق سے تعلق معمولی تھا، تو آزاد نے جو کچھ سنا، جو کچھ پڑھا ''آبِ حیات'' میں اس کو جگہ دے دی۔ لوگ اُن سے متفق نہیں ہوئے مگر بنیادی بات یہ ہے کہ اگر آزاد ''آبِ حیات'' نہ لکھتے تو کیا میر تقی میرؔ کی وہ موہنی تصویر، جو اب ہمارے ذہن میں ہے، ہم بنا سکتے تھے؟ اسی طرح ''آبِ حیات'' میں آزاد نے اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں لکھا تو یہ ساری باتیں صحیح تو ثابت نہیں ہوئیں، تحقیق نے ایک دوسرا رُخ اختیار کیا مگر آزاد نے کوشش تو کی۔ وہ کوشش مقبول نہیں ہوئی تو کیا ہوا؟ کوششیں تو ہوتی رہنا چاہییں، اس لیے کہ اس سے علم آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اگر آزاد نے اردو زبان کے ارتقا کے بارے میں لکھا تو آنے والوں نے اس پر مزید تحقیق کی۔ تو بات یہ ہے کہ آزاد نے کچھ خیالات پیش کیے اب آپ اس پر کام کرتے رہیے، وسعت پیدا ہوگی۔

عنبر: یعنی آنے والوں کے لیے آزاد نے ایک بنیاد فراہم کر دی؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: جی ہاں، بالکل ایک بنیاد فراہم کر دی۔ پھر آپ یہ دیکھیے کہ ''نیرنگِ خیال'' کو اگر آپ چاہیں تو افسانے کا ایک ابتدائیہ کہہ سکتی ہیں۔ انھوں نے جو تمثیلی مضامین لکھے اس طرز نے آگے چل کر افسانے کا رُخ اختیار کر لیا۔ تو یہ ساری باتیں ہیں۔ دیکھیے آزاد سے لوگ خوش اس لیے نہیں کہ انھوں نے کبھی کوئی ایسی روش اختیار نہیں کی جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے اور اپنے کام میں مصروف رہے، لیکن اب انھوں نے جو انجمنِ پنجاب کے تحت انعام دیے تو جس کو انعام نہیں ملا وہ ان کے خلاف ہو گیا۔ پھر آپ یہ دیکھیے کہ آزاد ۱۸۵۷ء میں اتنے بڑے المیے سے دوچار ہوئے تھے کہ مکان چھٹ گیا، باپ کو پھانسی ہو گئی، بیوی بچوں سے جدائی ہو گئی، خود مارے مارے پھرے، لاہور میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں معمولی نوکری کرتے رہے، وہ دہلی کالج سے نو سال کا کورس کیے ہوئے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ محکمۂ تعلیم میں معمولی سی جگہ مل گئی

لیکن انھیں ملکی تعلیم سے دل چسپی تھی، انھوں نے ”آئینۂ صحت“ گورنمنٹ کے سامنے پیش کی، ٹھیک ہے کہ وہ منظور نہیں ہوئی لیکن پھر انھوں نے ”اردو کی پہلی کتاب“، ”اردو کی دوسری کتاب“، پھر تیسری، چوتھی کتاب، اسی طرح ”فارسی کی پہلی کتاب“، ”فارسی کی دوسری کتاب“، ”فارسی قواعد“، ”اردو قواعد“ اور بہت سی کتابیں لکھیں اور ”اردو کی پہلی کتاب“ تو آج تک پڑھی جاتی ہے۔ تو کام انھوں نے بہت کیا ہے۔

عنبر: یقیناً آپ نے محمد حسین آزاد کے کارناموں کو نمایاں کیا ہے، جس کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ نے کراچی یونی ورسٹی میں ایک طویل عرصہ تدریس کے فرائض کی انجام دہی میں گزارا اور آپ ایک ممتاز پروفیسر رہے۔ اس وقت کراچی یونی ورسٹی میں کن شخصیات کے ساتھ کام کیا؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: اس وقت کراچی یونی ورسٹی باکمال اور بے مثال شخصیات کی آماج گاہ تھی۔ صرف شعبۂ اردو میں ہی نہیں بلکہ تمام شعبوں میں صاحبِ علم شخصیات تھیں۔ شعبۂ تاریخ میں ڈاکٹر محمود حسین خاں، ڈاکٹر ریاض الاسلام تھے۔ شعبۂ عربی میں ڈاکٹر محمد یوسف، پھر فارسی میں ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر عابد علی خان تھے۔ اسی طرح انگریزی میں ڈاکٹر علی اشرف، ڈاکٹر کلیم الدین، مایہ جمیل، ڈاکٹر مظفر نقوی، ڈاکٹر انیس احمد، ادھر شعبۂ اردو میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر شاہ علی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور میں تھے۔ اس وقت کراچی یونی ورسٹی گہوارئہ علم وادب تھی۔

عنبر: ایک بات بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ آپ کی نسل تک ہر میدان میں بڑے اعلیٰ پایے کی شخصیات نظر آتی تھیں، ابھی خود آپ نے کتنے نام لیے صرف ریڈیو اور یونی ورسٹی کے حوالے سے ہی۔ تو معاشرے میں شخصیات، ان کے انفرادی کردار نظر آتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے۔ کیا اب ہمارے تعلیمی اور معاشرتی حالات کے سبب ایسی شخصیات پیدا نہیں ہو رہی ہیں؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: بات دراصل یہ ہے کہ شخصیات بنائی جاتی ہیں۔ علمی، ادبی اور معاشرتی طور سے انسان کی تربیت کرکے ان کی شخصیت کی تعمیر کی جاتی ہے۔ اس زمانے میں پڑھانے والے بھی

ایسے ہوتے تھے جو کہتے کہ صاحب فلاں کتاب پڑھی آپ نے ؟ اور فلاں کتاب ضرور پڑھیے اور یہ کتاب بھی پڑھیے اور اگر کہیں نہ ملے تو مجھ سے آ کر لے لیجیے۔ بات یہ ہے کہ اب ترقی کرنے کے کئی متبادل راستے لوگوں کو میسر آ گئے ہیں اور علم کے بل پر ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا رجحان نہیں رہا۔ اب پڑھانے والے بھی ایسے نہیں ہیں تو شخصیت سازی کا عمل رُک گیا ہے۔

عنبر: آپ نے ادب کی، اپنے معاشرے کی شخصیات کے خاکے لکھے۔ خاکہ نگاری کا آغاز کیسے ہوا؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میں نے آپ کو بتایا کہ میں ابتدا سے افسانے لکھتا تھا، وہیں سے خاکے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی اور پھر حوصلہ افزائی بھی ہوئی کہ خاکے شائع ہوئے تو پسند بھی کیے گئے۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

عنبر: آپ نے اتنے خاکے لکھے ہیں ماشاء اللہ، کس شخصیت کا خاکہ خود آپ کو بہت پسند ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میں نے جو خاکے لکھے ہیں ان میں دو خواتین کے خاکے ہیں، ایک میری رشتے کی بہن تھی جمیلہ، جن کا خاکہ ''جانِ بے تاب'' لکھا تھا اور دوسری ادا جعفری۔ مجھے جمیلہ آپا کا خاکہ بہت پسند ہے۔ وہ کوتاہ قد کی بالکل دھان پان سی تھیں اور بے چاری دُنیا کی جیسے ہر ابتلا سے گزری تھیں کہ بچپن میں بندر نے کاٹ لیا، پھر کتے نے کاٹ لیا، پھر شادی ہو گئی تو ایک دفعہ ممیا ساس کے کہنے پر دیگ میں اُتر گئیں اور دیگ میں پھنس کے اس کے ساتھ لڑھک رہی ہیں۔ پھر میاں نے دوسری شادی کر لی۔ پھر ایکہ میں گھوڑا سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ پاکستان آنے کے بعد طویل عرصے میرے گھر رہیں۔ میرے بچوں سے بہت محبت تھی۔

عنبر: آپ خاکہ نگاری کو خود سوزی کا عمل قرار دیتے ہیں۔ اس کی کچھ وضاحت فرما دیجیے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میں نے جو خاکہ نگاری کو خود سوزی کا عمل کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خاکے لکھنے والا جس کا خاکہ لکھتا ہے اُس کو بھی جلاتا ہے اور خود بھی جلتا ہے کیوں کہ جس کا خاکہ لکھا جاتا ہے اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو تو احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ بہت سی ایسی باتیں اور پہلو ہوتے ہیں جن سے خاکہ لکھنے والا بخوبی واقف ہوتا ہے مگر وہ خاکے میں نہیں لکھ سکتا تو یہ ایک

خود سوزی کا عمل ہوا۔

عنبر: ڈاکٹر صاحب! آپ نے اصنافِ نثر میں جو کچھ کہا ہے اس کا بیشتر حصہ شائع ہو چکا ہے مگر شاعری کا کوئی مجموعہ شائع کیوں نہیں ہوا؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: سچی بات یہ ہے کہ اس کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ حالاں کہ میں نے لکھا بہت ہے۔ جب میں کراچی یونی ورسٹی میں تھا تو سحر انصاری کا کمرہ میرے کمرے کے برابر میں تھا۔ ایک دن میں نے ایک نظم لکھ کر چپراسی کے ہاتھ انھیں بھجوا دی۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور بہت تعریف کی۔ پھر میں روز ایک نظم لکھ کر انھیں بھجوا دیتا تھا۔ اسی طرح غزلیں بھی کہیں۔ شوؔر صاحب ایک دن اپنی غزل سنانے لگے تو میں نے کہا صاحب آپ نے غزل کا مقطع تو سنایا ہی نہیں اور اُن کے تخلص سے ایک شعر کہہ کے سنا دیا۔ (ہنستے ہوئے) اس کے بعد وہ اکثر جب کوئی غزل سناتے تو کہتے پہلے آپ اس کا مقطع سنا دیجیے۔ جب یونی ورسٹی جانا ختم ہو گیا تو سحر انصاری کو روز ایک نظم لکھ کر بھجوانے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب تو ہاتھ میں تکلیف کے باعث میں لکھ نہیں سکتا۔ نوالہ بنانا بھی مشکل ہوتا ہے، تو لکھنے پڑھنے کا کام تقریباً موقوف ہے بس فرصت میں غزلیں کہتا رہتا ہوں، کچھ شعر یاد رہ جاتے ہیں کچھ بھول جاتا ہوں۔

عنبر: ڈاکٹر صاحب! ہمیں تو ڈیڈی (سحر انصاری) بتاتے ہیں کہ آپ تو شوؔر صاحب کی گفتگو اسی وقت منظوم کر دیا کرتے تھے! سبحان اللہ۔ تو جو لکھا ہے، وہ اب شائع کروا دیجیے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: وہ کہیں زیادہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ کچھ بس میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ اور پھر اردو شاعری کا اتنا گراں قدر سرمایہ موجود ہے کہ آپ کو یہ بھی تو دیکھنا پڑتا ہے کہ آپ نے ایسا کہا ہے کہ آپ اسے شائع کروا رہے ہیں۔

عنبر: یہ تو آپ کا انکسار ہے۔ ہماری درخواست تو یہی ہو گی کہ آپ جلد از جلد شعری مجموعہ شائع کرا دیجیے۔ اچھا اردو شاعری کے حوالے سے ایک سوال ذہن میں آیا کہ ایک بات بار بار دہرائی جاتی رہی ہے اور اب خود پاکستانی ادیب، شاعر اور دانش ور بھی اس کی تائید کرنے لگے ہیں، اور وہ یہ کہ کہا جا رہا ہے کہ شاعری پاکستان میں اچھی ہو رہی ہے جب کہ تحقیق اور تنقید ہندوستان میں اچھی ہے۔ یہ بات دُرست ہے یا اصل مسئلہ کام کے پھیلاؤ کا ہے جس کی بنا پر یہ تاثر قائم ہو رہا

ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: تنقید پاکستان میں بہت اچھی لکھی جارہی ہے۔ڈاکٹر تحسین فراقی پاکستان میں بہت اچھی تنقید لکھ رہے ہیں،ڈاکٹر ناصر عباس نیر بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ یہ دونام تو وہ ہیں جو فوری طور پر میرے ذہن میں آگئے ہیں، یقیناً کچھ اور نام بھی ہیں جو بہت اچھی تنقید لکھ رہے ہیں۔ لیکن تحقیق انڈیا میں بہتر ہورہی ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں تحقیق کے مآخذ تک پہنچنے کا سلسلہ بہت واضح ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بھی بعض کام بہت اچھے ہوئے ہیں، مثال کے طور پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتابیں ''تاریخِ ادبِ اردو'' اور ''مثنوی کدم راؤ'' کی ترتیب اور مقدمے کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

عنبر: پاکستان میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کی رہنمائی میں آپ نے فعال کردار ادا کیا ہے۔ جو لوگ آپ کے زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کرتے ہیں، وہ فخریہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ ایک وقت تھا جب پی ایچ ڈی بہت کم ملتے تھے اور ان کی عزت بہت ہوتی تھی۔ اُن سے گفتگو کرکے احساس ہوتا تھا کہ ان کے پاس علم کا ایک خزانہ موجود ہے۔ آج ہر دوسرا شخص پی ایچ ڈی کا دعوے دار ہے مگر گفتگو کیجیے تو قابلیت میٹرک کی بھی نہیں نکلتی۔ کیا پی ایچ ڈی کو دوبارہ اعلیٰ معیار تک لایا جاسکتا ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: بالکل اعلیٰ معیار تک لایا جاسکتا ہے، اگر اس کا مقصد دلی وذہنی لگاؤ، شوق اور لگن ہو۔ محض جلد از جلد ڈگری کا حصول مقصود نہ ہو۔ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ پہلے پی ایچ ڈی کو بہت باوقار مانا جاتا تھا، اس لیے کہ تحقیق میں اتنا پھیلاؤ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب تحقیق بہت وسیع ہوگئی ہے، لیکن وسعت کے ساتھ ساتھ اس میں ہلکا پن بھی پیدا ہوا ہے۔ اب لوگوں کی ترجیح یہ ہوتی ہے کہ جلد از جلد مقالہ مکمل کرکے سند حاصل کرلی جائے تاکہ نوکری میں ترقی حاصل ہوسکے۔ اس صورت میں معیار تو یقیناً متاثر ہوگا۔

عنبر: ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو بچوں کے ادب پر بھی بہت کام کیا۔ ان کے لیے کئی کتابیں لکھیں اور ''میرا رسالہ'' نامی رسالہ بھی شائع کیا لیکن اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ جو بنیادی توجہ بچوں کے ادب پر ہونی چاہیے تھی وہ بڑے اور سنجیدہ لکھنے والوں کی طرف سے نہیں ملتی جس سے

بچوں میں ادب سے دل چسپی پیدا کی جائے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: ہمارے پرانے لکھنے والوں میں تو بڑے لوگوں نے بچوں کا ادب تخلیق کیا ہے۔ نذیر، شبلی، آزاد، حالی، چراغ حسن حسرت سب نے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظمیں تو آج تک پڑھی جاتی ہیں۔ پھر ہمارے اپنے دور میں کرشن نے بچوں کے لیے لکھا ہے، عصمت چغتائی نے بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا۔ آج بھی بچوں کے لیے کام ہو رہا ہے۔ ''ہمدرد'' نے بچوں کے لیے بہت کام کیا ہے اور اچھا ادب تخلیق کیا ہے۔ اسی طرح 'آکسفورڈ' سے بھی بچوں کے لیے اچھی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ تو ایسا نہیں ہے کہ بچوں کے ادب پر کام نہیں ہو رہا، شاید رفتار کچھ کم ہو مگر کام تو بہر حال اچھا ہو رہا ہے۔

عنبر: آپ کی بیگم جن کا نام تاج بیگم ہے، اُن کے بارے میں کچھ فرمایئے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: اردو ادب کے ایک بڑے معروف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی ہیں اور شاہد احمد دہلوی کی بھتیجی ہیں۔ انھوں نے دونوں کے بارے میں ایک ایک کتاب لکھی ہے اور ایک کتاب معروف افسانہ نگار اور ناول نگار خدیجہ مستور کے بارے میں بھی لکھی ہے۔ تاج بیگم نے گورنمنٹ کالج شاہراہِ لیاقت سے تعلیم حاصل کی اور پھر یہیں برسوں تدریسی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے سال بھر کراچی یونی ورسٹی میں بھی پڑھایا لیکن ان کا اصل تدریسی کارنامہ گورنمنٹ گرلز کالج کورنگی نمبر ۴ ہے جسے انھوں نے شروع کیا اور کراچی کی تعلیمی درس گاہوں میں ایک منفرد مقام تک پہنچا دیا۔ آج بھی وہ ایک کالج کی پرنسپل ہیں۔ تاج بیگم کو صفائی ستھرائی اور باغبانی کا شوق ہے اور ان کی وجہ سے ہمارے گھر میں صفائی ستھرائی، پھول اور دل آویزی نظر آتی ہے۔

عنبر: ماشاء اللہ! گویا آپ کی زندگی اور گھر دونوں میں بہار اُن کے دم سے ہے۔ وہ یقیناً ایک نہایت مہذب، نفیس اور شفیق ہستی ہیں۔ اسی لیے ہمیں بے حد پسند ہیں۔ اب کچھ اپنے بچوں کے بارے میں فرمایئے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے آصف ہیں، جو ڈاکٹر ہیں مگر وہ ڈاکٹری نہیں کرتے UNISEF میں ملازمت کرتے ہیں۔ ادیب ہیں، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔

ان کے افسانوں اور تنقید کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد کتابیں شائع کر چکے ہیں اور کتابی سلسلے کا ایک مرقع ''دُنیازاد'' کے نام سے شائع کرتے ہیں۔ چھوٹے بیٹے طارق ہیں، وہ بھی ملازمت کرتے ہیں مگر وہ ادیب نہیں ہیں۔

عنبر: ڈاکٹر آصف فرخی تو ماشاء اللہ ادبی دُنیا میں بہت اہم نام کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ خود اُن کی تحریروں کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: دیکھیے آصف کے بارے میں تو میں کوئی رائے نہیں دے سکتا کیوں کہ اگر میں کہوں گا کہ وہ اچھا لکھتا ہے تو کہا جائے گا کہ والد ہیں، اس لیے کہہ رہے ہیں تو آصف کے بارے میں کوئی رائے دینا میرے لیے مناسب نہیں۔ بات یہ ہے کہ میرا تو پورا گھرانا ہی ادیبوں کا گھرانا ہے۔ میرے نانا ادیب تھے، میرے دادا ادیب تھے، خود میرے والد شعر کہتے تھے، پھر میں لکھتا ہوں، میری ایک بہن خورشید ممتاز جو کئی سال ایک گورنمنٹ کالج میں پڑھاتی رہیں، وہ افسانہ بہت اچھا لکھتی تھیں مگر ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ میرے بھائی انور احسن صدیقی نے تو جتنا کام کیا ہے اور جو کارنامے کیے ہیں، میں دیکھ کر حیران بھی ہوتا ہوں اور خوش بھی ہوتا ہوں۔ انھوں نے بھی بچوں کے لیے کام کیا تھا۔ میں رسالہ نکالتا تھا ''میرا رسالہ''، اس کی ادارت میں نے انور کو سونپ دی تھی اور وہ بہت محنت سے یہ کام کرتے تھے۔ پھر انھوں نے طالب علموں کا ایک رسالہ ''لوح و قلم'' جاری کیا مگر پھر حکومت نے اس پرچے پر پابندی لگادی تو وہ بند ہو گیا۔

عنبر: مولوی عبدالحق کی زیرِ سرپرستی نکلنے والے اس پرچے کے کچھ شمارے چند روز قبل ہی دیکھنے کا اتفاق ہمیں بھی ہوا، وہ یقیناً عمدہ پرچہ تھا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: جی ہاں! مگر اس پر پابندی لگ گئی۔ انور احسن صدیقی نے تو قید و بند کی صعوبتیں بھی سہیں، جیل بھی گئے۔ ان کے ادبی کارناموں میں آٹھ ناول، بے شمار خاکے اور متعدد تحریریں شامل ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے مگر افسوس ہم لوگوں سے جلد رخصت ہو گئے۔ تو ہمارا گھرانا ایک مکمل علمی اور ادبی گھرانا ہے۔ میں لکھتا ہوں، میرا بھائی لکھتا رہا، اب ہمارے بچے لکھ رہے ہیں۔ گویا علم و ادب کی جو دولت ہمیں ورثے میں ملی تھی، ہم نے اُسے ضائع نہیں کیا۔

عنبر: ماشاء اللہ! بالکل بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے بارے میں ہمیں یہ

علم ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے آپ کا خاص سلسلہ ہے۔ آپ نے ان پر کتابیں بھی تحریر فرمائی ہیں۔ یہ روحانیت کا تجربہ کیسا لگا؟ اور ایک انسان کی زندگی میں تصوف اور روحانیت کی کیا اہمیت ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: میں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ پر ''دبستانِ نظام'' لکھی ہے جو ۵۰۰ صفحات کی کتاب ہے۔ اگر کوئی مجھ سے دریافت کرے تو میں کہوں گا کہ یہ وہ کام ہے جو میں نے واقعی کیا ہے اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ میرے نانا بچپن میں مجھے عرس کی محفلوں میں ساتھ لے جایا کرتے تھے، تو روحانیت سے تو بچپن سے ہی میرا ایک تعلق قائم ہو گیا تھا۔ اگر انسان مادّیت کی طرف بڑھ جائے اور دُنیا کی طلب زیادہ ہو جائے تو پھر روحانیت کا حصول ممکن نہیں۔ آج لوگوں میں دُنیا کی طلب زیادہ ہے اور پھر کچھ لوگوں نے اسے کاروبار بھی بنالیا تو یہ رجحان کم ہوا، مگر تصوف اور روحانیت سے انسان کا مرتبہ بلند ہوتا ہے، یہ طے ہے۔

عنبر: بے شک، بالکل درست فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب! ہمیں احساس ہے کہ آپ خاصی دیر سے تشریف فرما ہیں، بس آخری سوال کی زحمت اور دیں گے کہ آج جو عالمی صورتِ حال ہے اور جو ملکی صورتِ حال اور مسائل ہیں ان میں دانش وروں کا کوئی کردار ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی: اس صورتِ حال کو بہتر بنانے میں دانش وروں کا کردار ہو سکتا ہے۔ وہ صورتِ حال کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ لوگوں کو بتا سکتے ہیں کہ خوب صورت معاشرہ کیا ہوتا ہے اور معاشرے کو خوب صورت کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی معاشرے کو بہتر اور خوب صورت بنانے میں دانش وروں نے کردار ادا کیا ہے تو آج بھی کر سکتے ہیں۔

عنبر: بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! ہم نے آپ کا بہت وقت لیا اور آپ کو زحمت دی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی: ایسی بات نہیں، بلکہ آپ سے گفتگو میں میرا وقت اچھا گزر گیا۔

(بشکریہ کتابی سلسلہ ''اسالیب''، جنوری تا دسمبر ۲۰۱۳ء)

ڈاکٹر طاہر مسعود☆

چراغِ علم و آگہی: ڈاکٹر اسلم فرخی

ڈاکٹر اسلم فرخی، ایک بے مثل خاکہ نگار، ادیب، محقق، شاعر، ماہرِ زبان، مربوط و مرتب گفتگو اور تقریر کے فن کے ماہر، اب اس دنیائے خاکی و فانی میں نہ رہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے، موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ سو ڈاکٹر صاحب بھی دوست سے، ان کی روح، روحِ اعلیٰ سے جاملی۔ سو یہ ان کے لیے لمحۂ وصل اور ہم جیسے ان کے چاہنے والوں کے لیے لمحۂ جدائی کہ اب اس روئے زمین پہ ان سے کبھی مل سکیں گے، نہ انھیں دیکھ سکیں گے۔ یہی ہے اس زندگی کی حقیقت جسے بھول کر، فراموش کر کے اسی سے ہم چمٹے رہتے ہیں مگر موت جب آتی ہے تو لحظے بھر کے لیے آنکھوں سے پردۂ غفلت ہٹ جاتا ہے اور ہم تھوڑی دیر کو سراسیمہ سے ہو جاتے ہیں کہ یہ ہے انجام اس زندگی کا جس کے لیے ہم کتنا کشٹ اٹھاتے اور کتنا دُکھ بھوگتے ہیں۔

ڈاکٹر فرخی صاحب یوں تو گزر گئے اس جہانِ فانی سے، مگر سچ پوچھیے تو گزر کر بھی وہ موجود ہیں اور موجود رہیں گے اپنی کتابوں میں، اپنے خاکوں میں، اپنی شاعری میں اور ان یادوں میں جو ان کے ملنے ملانے والوں اور ان سے محبت کرنے والوں کے ذہنوں میں ہمیشہ تازہ ہیں اور رہیں گی۔ اس لیے کہ وہ کوئی ایسے عام سے آدمی نہ تھے جسے بھلادیا جائے۔ عام آدمی میں یوں تو کوئی خرابی نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ وہ کسی بڑے مقصد کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہوتا۔ پیدائش سے موت تک اپنے جبلی تقاضوں اور تکمیل سے بندھا ہوتا ہے تو حیوانوں کی زندگی بھی تو یہی اور ایسی ہی ہوتی ہے۔ انسان تو وہ ہے جو اپنے ہاتھ پیر سے، اپنے خیالات و افکار سے، اپنے پورے وجود سے دوسرے انسانوں کے لیے مفید ہو۔ جب جیے تو صرف اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے بھی جیے یعنی اپنی ذات سے اوپر اُٹھ کر سوچے اور کچھ کرے تو اپنے اور اپنے خاندان کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی کرے جو اس کے گرد و پیش رہتے بستے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی ایک ادیب،

☆ استاد شعبۂ ابلاغِ عامہ، جامعہ کراچی

دانش ور ایک استاد تھے اور استاد بھی زبان و ادب کے۔ وہ نرے استاد نہ تھے اور نہ نرے ادیب۔ ورنہ استاد اور ادیب تو بہت مل جاتے ہیں لیکن ان سے فیض کسی کو نہیں پہنچتا۔ اور جب آدمی استاد اور ادیب ہو کر بھی "بے فیضا" ہو تو اس کے استاد اور ادیب ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر تو ادب اور تعلیم بھی ایک تہمت ہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی طویل زندگی میں بے شمار کام کیے، متعدد اہم مناصب پر رہے۔ ادبی اور علمی حلقوں میں معتبر و محترم بھی ٹھہرے لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ، سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ان لوگوں کے لیے جو پڑھنے پڑھانے سے شغف رکھتے ہیں، ان کے سامنے ان برگزیدہ ہستیوں کی حیات کو بہ طور نمونۂ عمل رکھا کہ پڑھنے والے ان کی بابرکت زندگیوں سے ان کے حسنِ عمل سے حسنِ نیت سے کچھ سیکھیں اور سیکھ کر اپنے معاملات اور اپنی نیتوں کی بھی اصلاح کریں۔ آدمی، آدمی سے سیکھتا ہے اور آدمی، آدمی کو دیکھ کر بنتا ہے جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے تو سب سے بڑی خدمت آدمیوں کو آدمی بنانا ہے اور آدمی بنتا ہے اپنی خواہشات کو اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے تابع کرنے سے۔ اور یہی بات ہمیں اُن ہستیوں کی زندگیوں میں ملتی ہے جنھیں اولیاء اللہ یا صوفیائے کرام کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصّہ ان ہی اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کی حیاتِ طیبہ کو، ان کے اعمال و افکار کو محفوظ کرنے میں گزرا۔ ڈاکٹر صاحب کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے خاص عقیدت تھی، وہ ہر سال آپؒ کے عُرس میں شرکت کرنے دہلی جاتے رہے۔ یہی نہیں بل کہ آپ نے ان پر دو ایک نہیں پوری چھ کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سب سے معرکہ آرا تصنیف "دبستانِ نظام" ہے جسے وہ اپنے لیے "حاصلِ زندگی" قرار دیتے تھے۔ کہتے ہیں درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان شخصیات کی زندگیوں کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے جو حضرت نظام المشائخ سے بیعت ہو کر، ان کی اطاعت اختیار کر کے دوسرے انسانوں کے لیے مشعلِ راہ بنیں اور یوں انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی صحبتوں سے جو فیض اٹھایا، بے غرضی، بے نفسی کی جو نعمت غیر مترقبہ انھیں ملی، اسے انھوں نے دوسروں تک پہنچایا۔ یہی نہیں ڈاکٹر صاحب نے صوفیائے کرام کے اقوالِ حسنہ پر بھی کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتّب کیں، جو عوام و خواص دونوں

کے لیے یکساں مفید ہیں۔ اصل میں کوئی اپنی اصلاح پر آمادہ ہو تو اسے اپنے آپ کو ٹھیک کرنے، اپنے معاملات کو درست کرنے کے لیے بہت زیادہ علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآنِ حکیم کی چند آیتیں، چند احادیثِ مبارکہ، بزرگانِ دین کے کچھ اقوالِ حسنہ اس کی اصلاح کے لیے بہت کافی ہوتے ہیں اور کوئی آمادۂ اصلاح ہی نہ ہو تو پورا دین اور پورا نظامِ شریعت بھی اس کی مدد سے قاصر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو تصوف اور بزرگانِ دین کی طرف مائل کرنے والی شخصیت، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی ہے جو خود اردو ادب کے محقق ہونے کے علاوہ ایک بے نفس صوفی تھے اور ہزارہا لوگ جن کی صحبت کے فیض سے راہِ طریقت پر آئے۔ ڈاکٹر فرخی بتاتے تھے کہ ان کی جب مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سے ملاقات ہوئی تو مذہبی شعائر اور عبادات و اشغال سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا اور نہ طبیعت ہی اس طرف مائل ہوتی تھی۔ یہ صرف مولانا غلام مصطفیٰ خاں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے مسلسل ملاقاتوں کا اثرِ باطنی تھا کہ آہستہ آہستہ ان کی زندگی میں تبدیلی آتی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُستاد نے کبھی شاگرد کو کوئی نصیحت کی، نہ تبلیغ، یہ تک نہ کہا کہ ”میاں کیسے مسلمان ہو، نماز تو کم از کم پڑھ لیا کرو۔“ سب کچھ خود بخود ہوتا گیا۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب پنج وقتہ نمازی، روزے کے پابند، پھر نوافل یہاں تک نوبت پہنچی کہ تہجّد تک کی نماز قضا نہ ہوتی تھی۔ پھر قرآن حکیم، احادیث کی کتابوں کے ساتھ صوفیائے کرام کے حالات و ملفوظات کا مطالعہ کیا تو طبیعت خود بخود حضرت نظام الدین اولیاؒ کی محبت و عقیدت کی طرف مائل ہوگئی۔ حالاں کہ مولانا غلام مصطفیٰ خاں خود حضرت مولانا زوّار حسین شاہؒ سے بیعت تھے جو سلسلۂ نقش بندیہ سے منسلک تھے جب کہ حضرت نظام المشائخ سلسلۂ قادریہ چشتیہ سے تھے لیکن صوفیائے کرام کے قلوب میں وسعت ہی وسعت اور کشادگی ہی کشادگی ہوتی ہے۔ مولانا غلام مصطفیٰ خاں نے ڈاکٹر صاحب کی عقیدت کو ہمیشہ تحسین کی نظروں سے دیکھا، کبھی یہ نہ کہا کہ حضرت! سلسلۂ نقش بندیہ کے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے، وہ اپنے تقویٰ، علم اور بزرگی میں کیا کسی سے کم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں سیرت و کردار کی عظمت اور سراپا محبت ہونے کی وجہ سے جیسی قدر و منزلت مولانا غلام مصطفیٰ خاں کی تھی زندوں میں کسی اور کے لیے نہ تھی۔ جب ان کی

اپنی زندگی میں دینی لحاظ سے تبدیلیاں آنے لگیں تو انھوں نے باقاعدہ فیض حاصل کرنے کے لیے مولانا غلام مصطفیٰ خاں کے دستِ حق پرست پر بیعت کیا اور خود کو اصلاحِ باطن کے لیے ان کے سپرد کر دیا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے خاکوں کی کتابیں تو میں نے پڑھ رکھی تھیں اور اپنے اسلوبِ بیان اور قوتِ مشاہدہ کی وجہ سے ان خاکوں نے مجھے متاثر بھی بہت کیا تھا۔ ''گل دستۂ احباب''، ''آنگن میں ستارے''، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' اور ''موسم بہار جیسے لوگ'' جن سے میں نے سیکھا تھا کہ کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی زبان کسی شخصیت کا سراپا کھینچنے سے لے کر واقعات کے دل چسپ و دل کش بیان میں کتنی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت ان کے انتقال کی افسوس ناک اطلاع ایک دوست کے فون سے ملی، اس وقت میں ان کی سات کلاسیکی شاعروں کے ادبی خاکوں کی کتاب ''سات آسمان'' میں استاد شاعر محمد ابراہیم ذوقؔ کا خاکہ پڑھنے میں محو تھا، ایسا محو و مگن تھا کہ دلّی کی پوری تہذیب، بہادر شاہ ظفرؔ کا دربار اور اس زمانے کے علمی و ادبی مناقشے زندہ چلتے پھرتے جیتی جاگتی حالت میں جیسے میری نظروں کے سامنے تھے اور یہ عقدہ کھلتا جاتا تھا کہ مغل حکومت اور مغل تہذیب کیوں زوال پذیر ہوئی اور مٹھی بھر انگریزوں کی فوج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کیسے اور کیوں کر اس عظیم سلطنت کے فرماں رواؤں پر غالب آگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈوب کر اس دور کی تاریخ و تہذیب کی روح میں اتر کر یہ خاکے لکھے ہیں۔ تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کی تاریخ کا انھوں نے کتنا گہرا مطالعہ کیا ہوگا، دربار اور سلطنت کے اُمور و معاشرت اور اس زمانے کی ادبیات اور ادبی شخصیات پر اسی عمیق مطالعے کی وجہ سے ان کی نظر گہری اور بیان ایسا مستند و معتبر تھا کہ باید و شاید۔ غالباً اس مطالعے کا آغاز اسی زمانے میں ہو گیا تھا جب انھوں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے ''محمد حسین آزاد کی حیات اور تصانیف'' کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کا یہ بلند پایہ تحقیقی مقالہ دو جلدوں میں انجمن ترقیِ اردو سے شائع ہو کر علمی حلقوں میں بہت پہلے پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔

ایک استاد کے طور پر انھوں نے تحقیق کے بہت سے طلبا و طالبات کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرایا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میرا تحقیقی مقالہ ''اردو صحافت انیسویں صدی میں'' شائع ہوا اور

میں اس کا ایک نسخہ ان کے لائقِ فخر صاحب زادے آصف فرخی کو دینے گیا تو ڈاکٹر صاحب سے ڈرائنگ روم میں ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے سرسری طور پر کتاب دیکھ کر اس کی ضخامت پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا، فرمایا:

''آج کل پی ایچ ڈی کے مقالے ضخیم تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان میں فکری مواد کچھ ہوتا نہیں ہے۔''

میں ادب سے خاموش رہا۔ کافی دنوں بعد آصف نے ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون یہ کہہ کر میرے حوالے کیا کہ یہ آپ کی کتاب پر والد صاحب نے ریڈیو کے لیے تبصرہ لکھا تھا۔ یہ تبصرہ ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔ اب جو مضمون دیکھتا ہوں تو ایسی پذیرائی انھوں نے اس خاکسار کی کتاب کی کر رکھی تھی کہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ انھوں نے اس ضخیم کتاب کی بابت اپنی رائے سے نہ صرف رجوع کیا بلکہ کسی فرمائش کے بغیر ریڈیو پاکستان کے لیے اس پر تبصرہ لکھ کر نشر بھی کر دیا۔

ان سے قلبی تعلق اور زیادہ بڑھ گیا جب میں نے ان کی کتاب ''دبستانِ نظام'' پڑھی۔ پھر تو میں گاہے بہ گاہے ان کی خدمت میں حاضری دینے لگا۔ میں ان سے زیادہ تر تصوف کے اسرار و رموز کی بابت سوالات کیا کرتا تھا اور وہ ان کے نہایت کافی و شافی جواب دیتے تھے لیکن جو سوالات ان کے دائرہ علم سے باہر ہوتے تھے، اُن کے بارے میں صاف کہہ دیتے تھے کہ مجھے نہیں معلوم آپ کتاب یا کسی صاحب علم سے رجوع کیجیے۔ اپنی کم علمی یا لاعلمی کے اعتراف کی یہ اخلاقی جرأت بھی ان ہی میں دیکھی ورنہ کسی اور اہلِ علم کی زبانی اپنی کم علمی کے اعتراف کا کم از کم مجھے تو تجربہ نہیں۔

میں اکثر ان کے پاس شام کے وقت جاتا تھا، جب انھیں فرصت ہوتی تھی گیٹ کے اندر برآمدے میں دو کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں، جن پہ ہم بیٹھ جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو بہت مرتب ہوتی تھی۔ ان کی باتیں سنتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سلیقے سے لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔ مجھے یاد ہے یہیں بیٹھ کے انھوں نے مجھے سرسیّد احمد خاں کی کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' کا انگریزی ایڈیشن دکھایا تھا، جو لندن میں چھپی تھی اور جس کی تحقیق میں اٹھنے

والے اخراجات کے لیے سر سیّد نے محسن الملک کو اپنے گھر کا قیمتی سامان فروخت کر کے حاصل شدہ رقم اُنھیں بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔ یہیں بیٹھ کے ڈاکٹر صاحب اپنی ریڈیو پاکستان سے وابستگی کے دنوں کو یاد کرتے تھے، جب وہ بہ حیثیت اسٹاف آرٹسٹ ریڈیو پہ ملازم تھے۔ اُن دنوں وہ طالب علم تھے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے پڑھائی جاری رکھی ہوئی تھی اور پھر وہ مجھے بتاتے تھے کہ انھوں نے شمس زبیری کے ساتھ مل کر کس طرح رسالہ ''نقش'' نکالا تھا جس میں معاصر اردو رسائل سے بہترین افسانوں کا انتخاب کر کے شائع کیا جاتا تھا۔ ''نقش'' کے صرف دو ایک ہی شماروں پر ان کا نام چھپ سکا تھا، کیوں کہ ریڈیو کی ملازمت نام کی اشاعت میں آڑے آئی اور نام کے بغیر ہی کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر فرخی کو بچوں کے ادب سے خصوصی دل چسپی تھی اور کسی زمانے میں وہ بچوں کے لیے نظمیں اور مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ ان دنوں میں بچوں کے رسالے ''آنکھ مچولی'' کا مدیر اعزازی ہوتا تھا اور میری فرمائش پر آصف رسالے کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ مثلاً انھوں نے مشہور بنگالی فلم ڈائریکٹر ستیہ جیت رے کا بچوں کے لیے لکھا جانے والا ناول انگریزی سے ''تماشاگر'' کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جب میں یہ رسالہ دینے آصف کے پاس جاتا تھا تو اسے ڈاکٹر صاحب بھی شوق سے پڑھتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ شمس زبیری کے ساتھ مل کر انھوں نے بچوں کے لیے بھی ایک رسالہ ''میرا رسالہ'' کے نام سے نکالا تھا جس کے لیے وہ کہانیاں بھی لکھتے تھے اور انگریزی ادب سے ترجمے بھی کیا کرتے تھے۔ ایک پورا شمارہ ''نئی دنیا کی کہانیاں'' کے عنوان سے خاص نمبر انھوں نے شائع کیا تھا جس میں بچوں کے لیے امریکی اور مغربی ادب سے انھوں نے عمدہ اور دل چسپ کہانیوں کا انتخاب کر کے ان کے تراجم شائع کیے تھے۔ یہ بچوں کو بدیسی ادب سے متعارف کرانے کی بڑی کامیاب کوشش تھی جو بچوں میں بہت پسند کی گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب جب یہ تفصیلات بیان کر رہے ہوتے تھے تو میں سوچتا تھا کہ آخر کیا بات ہے کہ ہمارے بزرگ ادیب مثلاً قرۃ العین حیدر، غلام عباس، مرزا ادیب، امتیاز علی تاج، صوفی غلام مصطفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر وغیرہ بچوں کے لیے لکھنے میں دل چسپی رکھتے تھے بلکہ امتیاز علی تاج تو رسالہ ''پھول'' بھی نکالتے رہے (جو اصلاً ان کے والد مولوی ممتاز علی کا لگایا ہوا

پودا تھا جو تاج صاحب مرحوم کے ہاتھوں لہلہاتا ہوا درخت بنا)، جس کی ادارت طویل عرصے تک غلام عباس کے سپرد رہی لیکن نئے ادیبوں میں دو ایک کو چھوڑ کر کسی نے بھی بچوں کے ادب میں کبھی دل چسپی ظاہر نہیں کی اور نہ کبھی بچوں کے لیے کچھ لکھا۔ ڈاکٹر فرخی مرحوم نے تو بچوں کے لیے اپنی تحریروں کا اچھا خاصا وسیع ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ مثلاً انھوں نے اردو کے معروف ادبا اور شعرا مرزا غالب، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ پر بچوں کے لیے مختصر مختصر کتابیں لکھیں تاکہ ہمارے دور کے بچے اپنے بڑے لکھنے والوں سے ان کی زندگی اور ادبی و علمی خدمات سے واقف ہو سکیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں ہمدرد فاؤنڈیشن نے شائع کیں۔ پھر کچھ ہی عرصہ قبل انھوں نے آکسفورڈ سے اشاعت کے لیے پیغمبروں مثلاً حضرت نوح علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ پر بھی بچوں کے لیے کتابیں لکھیں تاکہ نئی نسل اپنے نبیوں کی حیاتِ طیبہ سے واقف ہو جائے۔ غرض دیکھا جائے تو ہمارے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی نہایت بامقصد گزری، انھوں نے اپنے علم اور قلم کو بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی آگاہی اور آگہی کے لیے وقف کیے رکھا اور یہ بڑی نادر اور خوب صورت بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی خدمات پر کچھ سال پہلے تمغۂ حسن کارکردگی ملا تو اطلاع ملنے پر میں ان کے لیے مٹھائی کا ڈبا اور پھولوں کا ہار لے کر حاضر خدمت ہوا۔ انھوں نے میرا دل رکھنے کے لیے پھولوں کا ہار پہن تو لیا اور دعائیں بھی دیں لیکن عجز و انکسار ان کے روّیے سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ اکادمی ادبیات نے بھی ان کے خاکوں کی کتاب ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' پر سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ انھیں دیا تھا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم ان شخصیات میں سے نہ تھے جن کے کمال فن کی معاشرے نے قدر نہ کی ہو۔ ان کے شخصی خاکوں نے انھیں ادبی حلقوں ہی میں نہیں عام پڑھنے والوں میں بھی مقبولیت سے ہم کنار کیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ دوسرے پروفیسروں کی طرح گوشۂ عافیت میں بیٹھنے کے بجائے پہلے انجمن ترقیِ اردو اور پھر وفاقی اردو یونی ورسٹی کے شعبۂ ترجمہ و تصنیف کے اہم مناصب پر فائز رہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ کراچی یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے چیئرمین کے عہدے پر اہلیت اور استحقاق کے باوجود انھیں فائز نہیں کیا گیا۔ لیکن قدرت کی طرف سے اس ناانصافی کی تلافی یوں ہوئی کہ وہ کراچی

یونی ورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے ناظم اور پھر رجسٹرار بنائے گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے دو بیٹے ہیں؛ آصف فرخی اور طارق اسلم۔ انھوں نے آصف کا ادبی ذوق دیکھتے ہوئے ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ کسی ادیب دوست سے ملنے جاتے تو آصف کو ساتھ لے جاتے اور کچھ ادیبوں سے تو صرف آصف کو ملوانے ہی کے خیال سے جا کر ملتے تھے۔ آصف نے اپنے کسی افسانوی مجموعے کو ان کے نام انتساب کرتے ہوئے ایک دل چسپ لیکن پر خیال فقرہ والد صاحب کا قلم بند کیا ہے۔ والد صاحب ننھّے آصف کو کندھے پر بٹھائے رات کے وقت کہیں جا رہے تھے، عقب سے آنے والی روشنی میں جو سائے آگے کی طرف پڑ رہے تھے، اسے دیکھ کر بیٹے نے خوشی سے چلا کر کہا، ''ابا دیکھیے میں قد میں آپ سے بڑا ہو گیا۔'' باپ نے شفقت سے مسکرا کر کہا، ''لیکن یہ نہ بھولو کہ تمھارے قد میں میرا قد بھی شامل ہے۔''

آپ کے اس فقرے سے میں نے باپ ہی کا نہیں استاد، اگر وہ واقعی استاد ہے تو اس کا ادب و احترام سیکھا۔

ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ تاج بیگم ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے ہیں اور خود بھی کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں، ڈاکٹر صاحب کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی نظر سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کی جہازی سائز تصویری پینٹنگ پر پڑتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی میدانِ ادب میں اس نسبت کا نہ صرف خیال رکھا بلکہ اپنے قلم اور علم سے اسے پوری طرح نبھایا بھی۔

ایک زمانہ میری ناسازیِ طبیعت کا ایسا بھی آیا جب میری حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ ایسے میں آصف فرخی جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں، وہ تو کام آئے کہ دوست تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی شفقت کو بھی میں نہیں بھول سکتا۔ فون پر بحالیِ طبیعت کے جو مشورے انھوں نے دیے اور جیسی فکر انھوں نے کی، اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی جن دنوں کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے، ڈاکٹر فرخی مرحوم رجسٹرار کے منصب پر فائز تھے، میرا بہ حیثیت لیکچرار تقرر ان ہی دنوں ہوا، سلیکشن بورڈ کے اجلاس میں وہ بہ حیثیت رجسٹرار موجود تھے اور بعد میں انھوں نے داد

بھی دی کہ تمھارا انٹرویو بہت اچھا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر واقع گلشنِ اقبال میں ہر اتوار کو باقاعدگی سے محفل جمتی تھی جس میں شہر کے اُدبا، شعرا و محققین جمع ہوتے تھے۔ ادبی و علمی گفتگوئیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک آدھ بار مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ جب سے ڈاکٹر صاحب ہسپتال سے واپس آئے تھے، طبیعت بگڑتی چلی گئی تھی، اتوار کی محفلوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ اور اب تو یہ محفل مستقلاً ہی اُجڑ گئی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم ہم لوگوں کے لیے سرمایۂ علم و آگہی تھے۔ اپنی تاریخ، اپنی ماضی اور اپنی علمی و تہذیبی روایات سے ہمارا رشتہ ان کے توسط سے بھی قائم تھا، وہ تو نہ رہے، ان کی کتابیں ہیں، خداوند تعالیٰ ہماری قوم کا رشتہ کتابوں سے جوڑ دے تا کہ قوم کو بھی اندازہ ہو کہ کیسی تہذیبی شخصیت تھی جو ہمارے درمیان سے اُٹھ گئی۔

۱

آصف فرخی

دعاؤں کا حصار

یہ الجھاوا بہت پہلے سے چلا آرہا ہے۔

اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ کون شخص تھا جو جیتے جی مر گیا اور وہ کون جو موت کے مرحلے سے گزر کر بھی زندہ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ وہ، وہ تھے۔ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک شخص میں رچی بسی تہذیب، زبان، ادب کا جیتا جاگتا مرقع۔ مگر میں، میں نہ بن سکا۔ میں ان کی تعزیت کیسے کروں، میں تو بس اپنے آپ سے اپنی تعزیت کر سکتا ہوں اور دعائے مغفرت اپنے لیے۔

میرے ابو میرے سارے وجود میں اس طرح سرایت کر گئے تھے کہ ان کا نقش بول اٹھتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو تہمت چند جو اپنے ذمے دھر چلے۔ اگر اپنے آپ میں سے ان کے نام کو علیحدہ کر دیا جائے تو پھر گنّے کا پھوک رہ جاتا ہے اور چند ایک برائیاں۔ یہ بات میں پوشیدہ رکھنا بھی چاہوں تو چھُپا نہیں سکتا۔ ابھی میں اندازہ نہیں لگا پایا ہوں کہ کتنے فی صد مر چکا ہوں اور کتنے فی صد زندہ رہ گیا۔

یہ خبر میرے جاننے پہچاننے والوں میں بھی پھیل چکی ہے۔ ابھی چند دن پہلے لاہور سے ایک تعزیتی پیغام آیا۔ بہت محترم اسکالر اور استاد، جن کو دوست کہتے ہوئے مجھے فخر ہوتا ہے۔ وہ بات کرتی ہیں تو جیسے منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ انھوں نے لکھا، عزیزم اسلم فرخی۔ ابھی اخبار کے ذریعے آصف فرخی کے انتقال کی خبر ملی۔ بہت صدمہ ہوا۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔۔۔

یہ التباس کئی بار ہوا اور اس کے دل چسپ حوالے ہیں جن سے میری یادیں منّور ہیں۔ منیر نیازی کراچی آتے تھے تو مجھ سے اور میرے والد سے ملنے آتے، دیر تلک باتیں کرتے، بہت خوش ہوتے۔ ایک بار کراچی آئے تو شاید میرا نام فوراً ذہن میں نہیں آیا۔ فاطمہ حسن سے کہنے

لگے بھئی کہاں ہیں وہ ایک جیسے باپ بیٹے۔ اس کے بعد انھوں نے کئی مرتبہ اسی نام سے یاد کیا۔

ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا کلیات ایک جلد میں شائع ہوا تو انھوں نے کمال مہربانی سے ایک نسخہ مجھے عنایت کیا۔ دستخط کرتے کرتے رُک گئیں لکھا: 'اسلم فرخی، آصف فرخی یعنی باپ، بیٹا اور۔۔۔' ان کی مسکراہٹ نے جملہ پورا کرنے کی ضرورت نہیں رہنے دی۔

اصل میں اچھا بھلا میرا نام تو آصف اسلم تھا۔ ابا نے یہی رکھا تھا۔ اس میں ان کی نسبت سے فرخی کا اضافہ یار لوگوں نے از خود کر دیا تو میں نے بھی قبول کر لیا۔ خوشی کے ساتھ مگر پھر اس میں سے آصف، غیر ضروری سمجھ کر نکالا جانے لگا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اوراق میں میرا ایک افسانہ شائع کیا۔ لکھنے والے کا نام اسلم فرخی۔ میں نے نشان دہی کی تو ڈاکٹر صاحب پوچھنے لگے اس میں غلطی کیا ہے۔

لیکن یہ معاملہ اس سے بھی پرانا ہے میرے بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ جوش ملیح آبادی کی رباعیات کے دو مجموعے نجوم و جواہر اور الہام و افکار شائع ہوئے تھے۔ رائٹرز گلڈ اس زمانے میں فعال تھا۔ اعلان ہوا کہ جوش صاحب گلڈ کتاب گھر میں آئیں گے، کتابوں پر دستخط کریں گے۔ ابو مجھے بھی لے گئے۔ وہ ادبی تقریبات میں مجھے بہت شوق سے لے جایا کرتے تھے۔ کتابیں خرید کر انھوں نے جوشؔ صاحب سے کہا اس بچّے کا نام لکھ کر دستخط کر دیجیے۔ جوش صاحب نے میرا نام پوچھا جو میرے والد نے بتایا۔ جوشؔ صاحب نے میرے والد کی طرف دیکھا۔ شاہد احمد دہلوی سے قرابت کا علم بھی ہوگا اور اس چشمک کی کوئی چنگاری یادوں کی بھوبل میں چمکی۔ جوشؔ صاحب نے لکھا، ''آصف صاحب کے بیٹے اسلم کے لیے—'' اور لکھ کر دستخط کر دیے۔

نام اُلٹ گئے، ابو نے ان سے تصحیح کرنے کے لیے کہا۔ جوش صاحب نے نام کاٹ کر وہی نام دوبارہ لکھ دیے، مجھے یاد ہے، ابو خاموش ہو گئے اور کتابیں لے کر وہاں سے چلے آئے۔ دستخط شدہ مجموعے مدّتوں ان کی الماری میں رکھے رہے۔

رہ گیا میں تو اس کے بعد سے میری ساری کہانی، نام کی کہانی ہے اور غالب کے الفاظ میں:

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا

کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ان کے نام سے منسوب اور ان کی یادوں سے مزین کتنے بہت سے اوراق ہیں، دل پر چھائی اداسی کی یلغار تھمے تو میں ان کو پلٹتا رہوں گا۔

ابو کے چلے جانے کے بعد سے جیسے ایک سناٹا سا چاروں طرف طاری ہو گیا ہے۔ ہر شے برف کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ برف پگھلے گی تب شاید کچھ کہہ سن سکوں گا۔ ادب و تہذیب میں رچی بسی پوری شخصیت کے بارے میں لکھنا تو دور کی بات، اس کو پوری طرح تصور میں لانا بھی میرے لیے محال ہے۔ چند خصوصیات کے تذکرے سے زیادہ کچھ کہنے کی تاب ہے نہ طاقت۔

ان کی پوری شخصیت محنت لگن اور استقامت سے عبارت تھی۔ انھوں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا، اپنی قوتِ بازو سے اور مشقت کے بعد حاصل کیا۔ زندگی میں کوئی چیز انھیں پلیٹ پر رکھی ہوئی نہیں ملی۔ وہ مال دار اور رئیسانہ مزاج کے حامل خاندان میں پیدا ہوئے جس کو برے وقتوں نے آلیا تھا۔ ابو نے مجھے بتایا کہ تنگ دستی کی وجہ سے آگرہ کے سینٹ جانز کالج سے ڈگری حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ مسلم لیگ کی سیاست اور ترقی پسند فکر سے لب ریز ہو کر وہ فرخ آباد سے بمبئی آ گئے۔ بیس، اکیس سال کی عمر میں بمبئی سے کراچی۔ بحری جہاز کا یہ سفر بڑی حد تک ایک حادثہ تھا۔ اس کے بعد واپسی کے راستے بند ہو چکے تھے۔ ان کے پاکستان چلے آنے کی پاداش میں ہندوستان کے کسٹوڈین نے میرے دادا کو آبائی مکان سے محروم کر دیا اور پورے خاندان کو پاکستان کا عازم ہونا پڑا۔ انھوں نے والدین کے ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالا، خود اپنے قدم اس نئے وطن میں جمائے۔ نوکری کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، پورٹ ٹرسٹ سے ریڈیو پاکستان اور ریڈیو سے پھر شعبۂ تعلیم میں آئے۔ ساری عمر کی محنت سے انھوں نے سفید پوشی کا بھرم رکھا اور عزت کمائی۔ محنت اور مصروفیت ان کی عادت سی بن گئی تھی۔

کڑی محنت کے ذریعے انھوں نے مرتبہ اور مقام تو حاصل کیا لیکن یہ مرتبہ ان کے لیے منزل نہیں تھا۔ ان کے مزاج میں بہت استغنا اور قناعت تھی۔ کسی عہدے یا مرتبے کی خواہش نہیں کی۔ جو مل گیا اس پر خوش ہو لیے، خوشی خوشی کام کیا اور کام مکمل کر کے سبک دوش ہوئے۔ کراچی یونی ورسٹی اس زمانے میں سانپوں کی پٹاری تھی۔ انھوں نے بہت سلیقے کے ساتھ دوستی اور

انسانی تعلقات نبھائے۔ پروفیسر شپ میں تاخیر اور صدرِ شعبہ نہ بن سکنے پر ملال کیا اور نہ اس کی وجہ سے کسی قسم کی تلخی اپنے اندر آنے دی۔

بلکہ ایک آدھ موقع پر جو تلخ بھی ثابت ہو سکتا تھا، اس کو اپنے مخصوص متبسّم انداز میں جھیل لیا۔ بہت عرصے کے بعد پروموشن کا سوال اٹھا اور ابو کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ ایک مخصوص شان بے نیازی کے ساتھ وہ اس انٹرویو میں گئے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ ڈاکٹر صاحب، آپ کی بدیہہ گوئی کی بڑی شہرت ہے۔ اس موقع کے لیے کوئی شعر کہہ دیجیے۔ انھوں نے سامنے بیٹھے ہوئے وائس چانسلر اور ڈین کی طرف رخ کیا اور فی الفور کہہ دیا:

نہ کرو خیال وی سی نہ فریب ڈین کھاؤ

وَتُعِزُّ من تشاءُ وتذّل من تشاءُ

خود بتایا کرتے تھے کہ سننے والوں کو سانپ سونگھ گیا، وہ کندھے جھٹک کر وہاں سے چلے آئے۔

نوجوانی میں مالی مشکلات کا سامنا کیا تو بڑی پامردی کے ساتھ۔ ان میں خودداری بہت تھی۔ مالی معاملات میں اور بھی زیادہ۔ اگر میں کسی مد میں پیسے خرچ کر دیتا تو جب تک روپے گن کر واپس نہ کر لیتے، ایک بے چینی سی رہتی۔ پیسوں کے معاملے میں تو نہیں، ہاں کتاب واپس کرنے میں غچہ دے جاتے تھے۔ ایک آدھ کتاب پر یہ بھی کہا کہ یہ بحکمِ سرکار ضبط ہوئی۔ تم دوسری کاپی خرید لوگے، تب مجھ سے واپس مانگ لینا۔

ظاہر ہے کہ ان کے حصے کی کتاب ان کے پاس رہتی تھی۔ وہ کتابیں حاصل کرنے اور جمع کرنے کے بھی شوقین تھے۔ انھوں نے مجھے سب سے زیادہ جس بات پر ٹوکا ہے، وہ یہی کتابوں کا شوق تھا۔ بچپن میں، میں ان کی کتابوں پر ان کے دستخط کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیتا تھا۔ لیکن ان کی ڈانٹ ڈپٹ میں بھی خوش گواری کا ذائقہ گھلا ہوتا تھا۔

محنت و قناعت کے ساتھ ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ان کی سلیقہ مندی اور نفاست کا ذکر بھی ہونا چاہیے اور پھر جس نظم و ضبط کے وہ قائل تھے۔ اپنے استعمال کی ایک ایک چیز وہ اس کی مخصوص جگہ پر اتنے اہتمام سے رکھتے تھے کہ مہینوں بعد بھی وہ چیز آنکھیں بند کر

کے اس جگہ سے اٹھا سکتے تھے۔ کتابوں کی بہتات سے گھبرانے لگتے تھے مگر الماری پر ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ چنتے تھے۔ چنانچہ تصوف کی کتابوں کے فوراً بعد غزلیاتِ خسرو، نذیر احمد اور آزاد سب الگ۔ نوجوانی میں اعلیٰ تراش خراش کے سوٹ پسند کرتے تھے۔ روزانہ خود استری کرکے بڑے اہتمام سے پہنتے۔ آخری دنوں میں بھی یہ معمول رہا کہ شیو کرنے اور کپڑے بدلنے کے بعد، کتابوں اور کاغذوں کے درمیان اپنی مسہری پر جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ گویا کام کرنے کے لیے تیار اور مستعد ہیں۔

کسی کام کے لیے دوسروں کا شرمندۂ احسان نہ ہونا چاہتے تھے۔ خودداری اور استقامت کا یہ حال آخری دم تک رہا۔ اپنی آخری آرام گاہ کے لیے کراچی یونی ورسٹی کے قبرستان میں جگہ پسند کرلی تھی۔ چنانچہ الاٹمنٹ لیٹر اور این او سی حاصل کرکے ان کی دو کاپیاں ایک فائل میں لگا دیں۔ تجہیز و تکفین کے اخراجات ایک لفافے میں بند کرکے فائل کے ساتھ رکھ دیئے۔ ایک آدھ مہینے پہلے مجھ سے کہا میرے شناختی کارڈ کی مدت ختم ہوگئی ہے۔ اس کو جاری کروادو۔

میں نے ٹالتے ہوئے پوچھا، کیا آپ کو پاسپورٹ بھی بنوانا ہے۔ انھوں نے اپنی مخصوص سادگی سے کہا، قبرستان میں کفن و دفن کے لیے چاہیے ہوتا ہے۔ بعد میں تمھیں دقت ہوگی۔ شناختی کارڈ بن کر آیا تو اس کے پندرہ دن بعد اس کے استعمال کی ضرورت پڑگئی۔

دل کی بیماری کو انھوں نے ایک عرصے تک جھیلا۔ لیکن اس بیماری نے ان کو چڑچڑا بنایا اور نہ بدمزاج۔ زندگی پہلے بھی دھیمی تھی، اب بالکل معتدل ہوگئی، وہ احتیاط کے قائل تھے اور اپنے مزاج کی حدّت کو نرمی میں ڈھال لیا تھا۔

وہ مریض بھی اپنی وضع کے تھے۔ انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا موقع ملتا تو ڈاکٹر سے بات چیت بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں کرتے، آنکھوں کی ڈاکٹر کے پاس علاج کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر مرتبہ اپنا حال بتانے سے پہلے آنکھوں کے بارے میں کسی کلاسیکی استاد کا شعر سناتے۔ ایک مرتبہ اس ڈاکٹر نے پوچھا کیا شکایت ہے۔

ابو نے جواب دیا، گوشۂ چشم میں خارش ہے۔

ایسے موقعوں پر مجھے ترجمانی کے فرائض انجام دینے پڑتے تھے کہ ابو کی آراستہ و پیراستہ

اردو کو ڈاکٹر صاحبان کی اردو میں منتقل کرتا رہوں۔

میرے ایک ہم جماعت امراضِ جلد کے ماہر ہیں۔ ساتھ میں باتوں کے رسیا بھی۔ ابو کو ان کی یہ بات پسند تھی کہ انگریزی میں اپنے نام کے ہجے اردو کے درست تلفّظ کے مطابق لکھتے تھے۔ ان کے پاس جانا ہوتا تو ابو پہلے سے تیار ہو کر بیٹھ جاتے۔ وہ حال پوچھتے تو ابو مسکرا کر جواب دیتے، ''ڈاکٹر صاحب آپ کے اعجازِ مسیحائی اور حسن توجہ کی بدولت پہلے سے بہتر ہوں۔''

پہلی مرتبہ تو یہ الفاظ سن کر ڈاکٹر صاحب کو پسینے آ گئے۔ اس نے کہا، یہ مجھے لکھ کر دے دیجیے۔ میں ان الفاظ کو فریم کروا کر رکھوں گا۔

آخری چند دنوں کی دو چار باتیں بھی بار بار یاد آتی رہتی ہیں۔

انھوں نے بیماری کے دوران شکایت کی اور نہ واویلا مچایا۔ جب تک بات کرتے رہے، گفتگو اسی طرح نستعلیق رہی۔ ٹانگ کے فریکچر کے باعث ٹریکشن بندھا ہوا تھا۔ غذا کے لیے ناک میں نلکی ڈالی گئی تھی۔ پیشاب کے لیے بھی نلکی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر پوچھا، کیا حال ہے۔ کہنے لگے، زندگی بے ہودگیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔

اسی دوران سیمیں نے ان سے کہا، آج آپ پہلے سے بہتر لگ رہے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا، میں جھڑوس معلوم ہو رہا ہوں۔

میں بار بار ان کے پاس آتا تو وہ پوچھتے، کہاں سے آ رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو، ہر بار پوچھتے، کیا لکھ رہے ہو، کیا پڑھ رہے ہو۔

کبھی سوال کرتے، شہر کا کیا حال ہے، ادبی محاذ پر کیا سرگرمیاں ہیں۔

ایک دن میں نے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے تو الٹا مجھی سے پوچھنے لگے۔ تم بتاؤ تمھاری صحت کیسی ہے۔ تم بہت کام کرتے ہو، آرام نہیں کرتے۔

ایسا لگ رہا تھا وہ تیماردار ہیں اور میں مریض۔

بدن کی طرح ذہن بھی آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ کبھی بھول جاتے، کبھی کسی اور جگہ پہنچ جاتے۔ لیکن میں جب بتاتا کہ فلاں شخص نے آپ کی خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا ہے تو جواب دیتے۔ ن م دانش کا میسج آیا تو مجھ سے کہا، مجھے یاد ہے۔ ایسے شاگردوں کو کون بھول سکتا

ہے۔ ہندوستان سے شمس الرحمن فاروقی صاحب نے فون کیا تو مجھ سے کہا، ان کا شکریہ ادا کر دینا۔ فاروقی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ ایک دن سحر انصاری صاحب کو بہت دل چسپ انداز میں یوں یاد کیا گویا وہ لندن میں ہیں اور وہاں سے واپس آرہے ہیں۔

طرزِ ادا کی لکشی کے باوجود وہ اپنے کام کی بات پوری کر لیتے تھے۔ امراض قلب کے جس ماہر کے پاس زیرِ علاج تھے۔ اپنی حالت بھانپ کر انھوں نے بڑی سادگی سے کہا تھا میرا وقت آرہا ہے۔ زندگی کی ذمے داریاں پوری ہو گئی ہیں۔ آپ مجھے تختۂ مشق نہیں بنائیں گے۔ کاغذ پر دستخط کر دیے کہ مصنوعی ذریعے سے زندہ نہیں رکھا جائے گا۔

زندگی کی ہر حقیقت کی طرح وہ موت کے لیے بھی تیار تھے۔

وہ ایک ہوتے ہوئے بھی میرے لیے بہت سارے تھے۔

سب سے پہلے مجھ میں میرا آپ۔ پہلے آپ۔ پھر آپ سے بڑھ کر باپ، استاد، رہ نما، مثال اور دوست۔

باپ کی حیثیت سے وہ سخت گیر نہیں تھے۔ ان کے مزاج کی نرم خوئی ایسی تھی کہ میرے جیسے خود سر بچّے اسے کمزوری بھی سمجھ سکتے ہیں۔ غصّہ ضرور کرتے تھے مگر مار پیٹ کے قائل نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بھائی کو اور مجھے ایک مرتبہ تھپڑ مارا تھا۔ ہم ناظم آباد میں رہتے تھے، گھر کے پیچھے پارک تھا۔ بھائی ضد کر رہا تھا کہ پارک لے چلو۔ میں پتا نہیں کیوں، جانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس وقت تک گھر گھسنا بن چکا تھا۔ ہماری بحث تکرار شور میں ڈھل گئی تو ابو کام کرتے سے اٹھ کر آئے اور ایک ہاتھ رسید کیا۔ اس کے علاوہ کبھی یاد نہیں آتا کہ انھوں نے ہاتھ اٹھایا ہو۔ ہاں، ڈانٹ ڈپٹ کی فریکوئنسی لگ تھی۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، ایک مرتبہ وہ مجھے سخت سست کہہ رہے تھے اور مجھے ہنسی آگئی۔ ان کی ڈانٹ اس وقت بہت پیاری لگی، میں نے ان سے کہا، آپ پورے گھر میں کسی اور کو نہیں ڈانٹتے۔ مجھے ڈانٹ رہے ہیں تو یہ میرے لیے بڑی بات ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد اسی طرح ڈانٹا کیجیے۔

ایک مرتبہ میرے کالج میں امتحان کی تیاری کی چھٹّیاں تھیں۔ میں سخت پڑھائی پر مامور

تھا۔ ابو تیار ہو کر یونی ورسٹی چلے گئے تو میں نے میڈیسن کی کتاب کے بیچوں بیچ بالزاک کا ناول "یوژین گرانڈے" کھول لیا۔ اتفاق سے وہ جلدی واپس آ گئے اور مجھے کتاب چھپانے کا وقت نہیں ملا۔ انھوں نے دیکھ لیا، ڈانٹنے کے بجائے نصیحت کا پیرایہ اختیار کر لیا، "اپنے آپ کو دھوکا دینا چھوڑ دو۔۔۔۔ یہ طے کر لو کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔۔۔۔" انھوں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ان کا افسوس ان کی ڈانٹ سے زیادہ اثر رکھتا تھا۔ بالزاک کا وہ ناول مجھ سے آج تک پورا نہیں پڑھا جا سکا۔

ڈانٹتے وقت وہ برا بھلا بھی کہتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے یوں ٹوکا کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ اس سے زیادہ سخت الفاظ ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایسی بات نہیں کہ میرے ان کے درمیان اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ ضرور ہوتا تھا اور مجھے اندازہ ہے کہ ان کو ناگوار گزرتا تھا۔ اس کے باجود وہ اپنی برہمی کا اظہار بھی اپنے مزاج کے رکھ رکھاؤ اور تہذیب کے اس دائرے میں رہ کر کرتے جس سے وابستگی ان کی شناخت کا نمایاں پہلو تھا۔

کسی سے ناراض ہوتے تو اس کا اظہار بھی اسی طرح ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اپنے کسی دفتری ساتھی کے سپرد کوئی کام کر دیا۔ وہ حسب دل خواہ پورا نہیں ہوا تو ان صاحب سے کچھ نہ کہا، ناراض ہو کر مجھ سے کہنے لگے اب اگر وہ صاحب جلتے توے پر اپنی تشریف رکھ دیں تب بھی میں ان سے کوئی کام نہ کہوں گا۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اس پر وہ اور زیادہ ناراض ہوئے مگر ذرا دیر بعد دیکھا تو غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

یہ شاید اس تہذیب کا تقاضا تھا کہ کسی کو برا کہنا ہوتا تو کہتے، کیوں نہ ہو، آخر کو کنجڑے قصائی ہیں۔ ایک اور صاحب کے ذکر پر کہتے، چھوڑیے صاحب، جلاہے ہیں۔ یا پھر فلاں صاحب کا تعلق اس علاقے سے ہے، ان کے ریاستی مزاج میں سازش بھری ہوئی ہے۔

مجھے اس روش پر ہمیشہ اعتراض ہوتا کہ یہ کیا بات ہوئی ان کا خاندان اگر جلاہے کا خاندان ہے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟

ان کے پاس جواب موجود تھا، "اگر وہ جلاہا پن نہ دکھاتے تو ہمیں کیا برا تھا؟"

اس معاملے میں ان سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ ہر ایک کے خاندان کی تفصیل معلوم

کرتے۔ کون لوگ ہیں، وطن کیا ہے؟ تفصیلات کی بھرماران کے ذہن میں محفوظ تھی۔ پھر مختلف علاقے، ان کے خاندان، ان کے رسم ورواج اور اطوار، کسی نے چھیڑا نہ ہو تب بھی یہ ذکر آگیا تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔

حوالوں کا پورا ایک سلسلہ ان کے ذہن میں آباد تھا، جو وقت گزرنے کے باوجود مدھم نہیں پڑ سکا تھا۔

ان کے ایک رفیق کار جو صحافت کے شعبے میں پروفیسر تھے، ان کا نام آتا تو دُہراتے، یہ سندیلے کے ہیں، جہاں کے لڈو مشہور ہیں۔ ایک اور صاحب کا نام سن کر کہتے، ارے وہ تو فلاں جگہ کے ہیں، وہی جہاں طبلہ جوڑی۔۔۔ اور ایک لوک گیت کا حوالہ دے کر ہنستے۔ آخری دنوں میں ڈاکٹر حسن منظر صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی تو دیر تک اسی طرح باتیں کرتے یا پھر پرانی فلموں، پرانے گیتوں کو حافظے میں دُہراتے، کبھی فون نہ ہو سکتا تو پیغام رسانی کا فریضہ مجھے سرانجام دینا پڑتا۔ حسن منظر صاحب نے مجھ سے کہا، ڈاکٹر صاحب سے پوچھ کر بتائیے کہ بریلی کے بازار میں جو جھمکا گرا تھا وہ کہاں گیا اور وہ بازار کونسا ہے۔

ابّا نے جواب دیا، وہ جھمکا کھو گیا اور بازار خاک میں مل گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے، ان کا خاندان تو مُراد آباد کا ہے۔ ان سے پوچھو کہ یہ جو کہتے ہیں مر گئے لالہ جھمّن لال، ملائی کی ٹھنڈی برف کھلانے والے۔۔۔

پھر خود ہی جواب کا خیال آگیا، شمس زبیری وہاں کے تھے۔ وہ کہتے تھے مرادآباد میں جھمّن لال کی دکان تھی۔

ایک مرتبہ ایسی ہی یاد بڑی شدّت کے ساتھ آگئی، کہنے لگے انتظار حسین کو فون کرو کہ وہ جو میرٹھ میں مردہ زندہ ہو گیا تھا، وہ کیا بات تھی۔

یہ حوالہ انتظار حسین کے کسی کالم میں انھوں نے پڑھ لیا تھا۔ محدب شیشہ لگا کر بڑے جتن سے مسعود اشعر اور انتظار حسین کے کالم پڑھ لیتے۔ پھر مجھے فون کرتے، آج انتظار حسین نے خوب چٹکی لی ہے۔ یا پھر آج کا کالم مجھے جچا نہیں۔

یہ رواں تبصروں کا انداز بھی خوب تھا۔ انتظار صاحب کے کالم پڑھنا اور ان پر رائے زنی

کرنا ان کے لیے بہت ضروری تھا اور قریبی مراسم کا اہم حصہ۔ انتظار حسین سے دعا سلام تو بہت پرانی تھی مگر اس سے زیادہ نہیں۔ انتظار صاحب اصل میں میرے دوست تھے۔۔۔ میں یہ بات بہت فخر کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔۔۔ آہستہ آہستہ بہت گھل مل گئے تھے، گھر آنا جانا تھا، بے تکلف گفتگو تھی مگر میرے اور ابو کے دوست ادل بدل جاتے۔ ضمیر نیازی، حسن منظر، انتظار صاحب۔۔۔ ابو کا شروع شروع میں یہ کہنا مجھے یاد ہے کہ انتظار صاحب اپنے گروہ کے دوستوں کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن میں نے ان کی دو ایک کتابیں پڑھ لی تھیں تو جب ہم پہلی بار لاہور گئے تو مجھے ان سے اور ناصر کاظمی سے ملوایا۔ ناصر کاظمی کو میں نے سلام کیا۔ انھوں نے مجھ سے میرے نام کے معنی پوچھے۔ پھر احمد ندیم قاسمی صاحب کو سلام کرنے کے لیے خاص طور سے ان کے دفتر لے گئے۔ پھر انتظار صاحب سے میرا تعلقِ خاطر قائم ہو گیا۔ ان کا بھی یہ معمول بن گیا کہ کراچی آتے تو ابا سے ملنے کے لیے خاص طور پر آتے اور دونوں دیر تک یادوں کو کُریدتے رہتے۔ ابو اپنی کتابوں پر کسی کی رائے یا تبصرے کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے لیکن انتظار صاحب نے کالم لکھا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

وہ اپنے دوستوں سے ملتے جلتے تو مجھے بھی گفتگو میں شریک ہونے اور محفلوں میں شامل ہونے کا موقع دیتے۔ اسی طرح میرے دوست، ملنے جلنے والے گھر آتے تو ان سے دو چار باتیں ضرور کرتے۔ زیادہ دن ہو جاتے تو پوچھتے وہ فلاں صاحب کہاں ہیں، یا ان کا نام اخباروں میں نظر نہیں آیا، کیا بات ہے؟ وہ سب کی خبر گیری کرتے رہتے۔ اسی طرح بچوں کی تعلیمی مصروفیات اور ان کی پسند ناپسند سے برابر دل چسپی لیتے۔ ان کی درجہ بدرجہ چھوٹی بڑی کامیابیوں پر بہت فخر محسوس کرتے، خوشی کا اظہار کرتے۔

زندگی کی کتنی بہت سی سطحوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔

ان کے ادبی پہلو پر تو بات ہو گی مگر مجھے عام زندگی کی بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ ان کے شوق کا ذکر ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بات فلم تک نہ پہنچے، زمانۂ طالب علمی سے فلم کے رسیا تھے۔ ہمیں سنایا کرتے تھے کہ کس طرح امتحان سے پہلے فلم دیکھنے کا اہتمام کرتے بڑے ”ٹھاٹ

سے" وہ یہ الفاظ استعمال کرتے۔ نیو تھیٹرز فلموں کو بہت شوق سے دیکھا تھا، سہگل اور کانن بالا کے بول ازبر تھے۔

صبح ہم اسکول کے لیے تیار ہوتے تو ریڈیو سیلون لگا رہتا۔ پرانے گیتوں کے پروگرام میں آخری گیت سہگل کی آواز میں نشر ہوتا۔ اس گیت کے ختم ہوتے ہوتے سات بج جاتے۔ وہ وجد کے عالم میں باہر آجاتے، پھر طارق کو اور مجھے اس چھوٹی سی پلیا پر چھوڑنے جاتے جہاں سے اسکول بس ہمیں روزانہ صبح کے وقت ملا کرتی تھی۔

وی سی آر کا دور آیا تو میں نے ڈاکٹر حسن منظر کے عمدہ ذخیرے سے نیو تھیٹرز کی کئی فلمیں ان کو دکھانے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت تک دل اچاٹ تو نہیں ہوا تھا، اونچا سننے لگے تھے۔ ایک فلم کی تلاش تھی۔ کہتے تھے اب صرف پہلا سین یاد رہ گیا ہے۔ دریا پر ناؤ چل رہی ہے۔ اس میں ایک آدمی اور عورت بیٹھے ہیں۔

آدمی پوچھتا ہے، کیا تمھیں مجھ سے محبت ہے؟

معلوم نہیں، عورت جواب دیتی ہے۔

یہ ادھورا منظر بھی انھوں نے اس وارفتگی کے ساتھ سنایا تھا کہ مجھے یاد رہ گیا۔

مگر اس وقت کی فلموں میں پسندیدہ فلم ان کے لیے رتن تھی۔ اس کے گانے ازبر تھے۔ کبھی زیرِ لب دہرایا کرتے، او جانے والے بالموا، لوٹ کے آ۔۔۔ ان کو یہ یاد تھا کہ پہلی مرتبہ کس سینما ہال میں اور کس تاریخ کو دیکھی تھی، پھر اس کے بعد کوالٹی ریسٹورنٹ میں سینڈوچ کھایا تھا جس کی قیمت چار آنے تھی، اس وقت کے لحاظ سے خطیر رقم، وہ بتاتے تھے کہ فلم روائتی تھی اور سورن لتا ان کے بقول ہیرو کی اماں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے باوجود باکس آفس پر کامیاب رہی۔ خود ابو نے کچھ نہیں تو چودہ مرتبہ دیکھی تھی۔ پندرھویں بار میرے ساتھ وی سی آر پر اور اس وقت بھی گانوں پر جھومتے رہے۔

کراچی کے پرانے سینما گھروں کے نام اور پتے ازبر تھے۔ انگریزی فلموں کا شوق تھا، خاص طور پر ہالی وڈ کی بلاک بسٹر یا پھر اہم ناولوں پر مبنی فلمیں، جیسے ہیمنگوے کے ناول۔ ان کو بطور خاص انگرڈ برگ مین پسند تھی۔ لیکن ہالی وڈ کی ہیروئنز میں صرف الزبتھ ٹیلر۔ اس کے آگے

کوئی چراغ نہیں جل سکتا تھا۔

میں نے جولیا رابرٹس کا بہت ذکر کر کے دیکھ لیا لیکن الزبتھ ٹیلر کے آگے دال نہ گلی۔ اصل میں اس وقت تک ان کا فلم دیکھنے کا ڈھنگ بدل گیا تھا۔ گھر پر بیٹھ کر ہندوستانی فلم دیکھنے کو ترجیح دیتے، اس میں پورا کرنے کی پابندی بھی نہیں ہوتی تھی۔ ''گرم ہوا'' اور ''امراؤ جان ادا'' میں لکھنو کا پس منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر ایک خاص لطف ان کو امیتابھ بچن کی ان فلموں میں آتا، جہاں وہ گھونسا لات چلاتا۔ ''گدّم پٹخنا'' اس کے لیے وہ ترکیب استعمال کرتے اور بہت خوش ہو کر ایسی فلمیں دیکھتے۔ اسی طرح چارلی چپلن کی فلمیں بہت پسند تھیں، ان کو بہت خوش ہو کر دیکھتے۔ خصوصاً وہ سین جس میں چارلی چپلن ایک بہت موٹے آدمی کے پچھائے پر گرم استری پھیر دیتا ہے۔

ہم چھوٹے تھے تو بڑے اہتمام کے ساتھ ہمیں فلم دکھانے لے جایا کرتے تھے۔ والٹ ڈزنی کی کئی فلمیں اور افریقہ کے جنگلوں کی ایک آدھ فلم ہم نے اسی طرح دیکھی پھر ایک وقت آیا کہ اکرم چچا ناظم آباد میں شالیمار سینما کے سامنے منتقل ہو گئے۔ اب تو اس کو بھی ڈھا کر اس کی جگہ فلیٹ بنا دیئے گئے ہیں، کراچی کے بہت سے سینما گھروں کی طرح۔ کوئی ایسی فلم لگتی جو ہماری امّی دیکھنا چاہتیں تو اکرم چچا منیجر کو کہلوا دیتے۔ تین سے چھ والا شو دیکھا جاتا اور اس سے پہلے کھانا۔ فلم شروع ہونے لگتی تو منیجر کسی لڑکے کو بھیج کر کہلوا دیتا، پروفیسر صاحب فلم شروع کرنے والا ہوں، اب آ جائیے۔ چنانچہ ہم گھر سے نکل کر فلم دیکھنے چلے جاتے۔ ان میں سے اکثر فلمیں بالکل معمولی اور ردّی ثابت ہوتیں مگر یہ الگ قصہ ہے۔

جس یونی ورسٹی میں، میں پڑھاتا ہوں وہاں کے ایک استاد نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں اردو کی کس لغت کو حوالے کی کتاب کے طور پر زیادہ استعمال کرتا ہوں۔

میرے منھ سے بے ساختہ نکلا، ''ابو!''

میرے رفیق کار میرے والد کے علمی و ادبی حوالوں سے کسی قدر واقف تھے۔ وہ مرعوب ہو کر کہنے لگے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کوئی لغت بھی ترتیب دی ہے۔

اس کا کیا نام ہے؟

پھر مجھے بتانا پڑا کہ وہ لغت دراصل خود ہیں۔ لغُت کی ورق گردانی کون کرے؟ مجھے یہ آسان معلوم ہوتا تھا کہ کسی لفظ یا تلفظ پر اشتباہ ہے یا کسی شعر پر ذہن اٹک گیا، کوئی ادھورا مصرع یاد آرہا ہے یا کسی شعر کا محض ایک مصرع، ابو سے پوچھ لیا۔ وہ بتا دیتے اور اگر کہیں اٹکتے تو جب تک پوری طرح معلوم نہ کر لیتے، بے چین رہتے۔ پھر تلاش کر کے جواب حاصل کر لیتے تو بتا دیتے اور سکون کا سانس لیتے گویا یہ مسئلہ انھیں ہی تنگ کر رہا تھا۔ بہت عرصے تک انھوں نے کسی بھی لغت سے بے نیاز رکھا۔ ہنس کر کہتے کتابیں دیکھتے دیکھتے ہم خود کتاب ہو گئے ہیں۔

سیکڑوں لوگ ان کے پاس صرف اسی مقصد کے لیے آتے یا ٹیلی فون کرتے۔ صاحب فلاں لفظ۔۔۔ فلاں شعر کا پہلا مصرع۔۔۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے جن سے کوئی جان پہچان بھی نہ ہوتی۔ ابو نے اپنی معلومات دوسروں تک پہنچانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کا علم حاضر اور حافظہ غیر معمولی تھا۔ شعر تو شعر، انھیں نثر کی عبارتیں یاد تھیں۔ آزاد کے تو خیر مداح تھے، فسانہ عجائب کے ٹکڑے روانی کے ساتھ دُہرا دیتے اور کیا مجال کہ کوئی لفظ اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔

ان کی بینائی رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی اور پڑھنا ان کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ایک چھوڑ دو اخبار روزانہ کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے والا شخص مجبور ہو گیا کہ صرف موٹی موٹی سرخیوں پر اکتفا کر لے۔ ڈاکٹر نے تجویز کیا کہ محدب شیشے کی مدد سے کام چلائیں مگر وہ اس طریقے سے ایڈجسٹ نہ کر پائے۔ کتاب پڑھنا کم ہوا تو وقت گزاری کا مسئلہ بھی بڑھ گیا۔ لیکن حافظہ مدد کو آیا۔ کتاب سے فاصلہ بڑھا تھا، ادب سے تو نہیں۔ انھوں نے یہ طریقہ وضع کر لیا کہ صبح اٹھ کر طے کر لیتے کہ آج کس شاعر کو پڑھنا ہے، پھر دن بھر اس کے اشعار حافظے کی مدد سے دُہراتے جاتے، زیرِ لب ان کا جیسے ورد کیے جاتے۔ ایک دن مجھ سے کہا، آج آتشؔ کو پڑھ رہا ہوں۔ آتشؔ کو دل ہی دل میں دُہراتے جاتے۔ یوں بھی آتشؔ ان کے پسندیدہ شاعروں میں سے ایک ٹھہرے۔ ان کو شکوہ تھا کہ اردو نقادوں نے آتشؔ و ناسخؔ کے سلسلے کے شاعروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا، یہاں تک کہ مجلسِ ترقیِ ادب نے بھی رندؔ، صباؔ اور وزیرؔ کے دیوان نہیں شائع کیے۔

ایک بار میں نے کہا کہ ماضی کے بعض شاعروں کی شخصیات بہت مسحور کرتی ہیں، ہزاروں سوالوں کو جنم دیتی ہیں۔ مجھے کسی ایک شاعر سے ملاقات کا موقع مل جائے تو میرا انتخاب آرتھر راں بو ہو گا۔ پھر ان سے پوچھا، آپ کس سے ملاقات کرنا پسند کریں گے؟

آتشؔ، ان کا جواب تھا۔

یوں ان کی پسند ناپسند بہت واضح ہوتی اور دوٹوک۔

انگریزی کے جاسوسی اور سراغ رسانی ناول بہت شوق سے اور کثرت سے پڑھتے تھے۔ مگر قائل چند ہی ناموں کے تھے۔ شرلاک ہومز کے قصّے تو نہ جانے کتنی بار پڑھ چکے تھے۔ پھر بھی مجھ سے کہتے، ایک جلد والا نسخہ بڑے ٹائپ میں مل جائے تو میرے لیے دیکھتے رہنا۔ ایک زمانے میں ارل اسٹینلے گارڈنر کے ناول پڑھتے تھے، خاص طور پر پیری میسن والے سلسلے کے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ان کی تمام تر توجہ فرانسیسی ادیب Georges Simenon جارجز سیمینوں پر منعطف ہوگئی۔ اس کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتے اور جمع کرتے جاتے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ سیمینوں صرف جرائم نہیں بلکہ انسانی نفسیات پر اپنے ناولوں کی بنیاد رکھتا ہے۔

نوعمری میں انھوں نے تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے کثرت سے پڑھے تھے اور رینالڈو کے سیکڑوں ناول جو اردو میں دستیاب تھے۔ کتنی ہی کتابوں کے نام وہ گنوایا کرتے تھے۔ ادبی مرتبے کے لحاظ سے قدرے بہتر رائڈر ہیگرڈ بھی ان کے پسندیدہ لکھنے والوں کی فہرست کا یک اہم نام تھا۔ اس کے ناول کنگ سولومنز مائنز بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سی اور رٹرن آف شی کو نہ جانے کتنی دفعہ پڑھ چکے تھے۔ شی کا اردو ترجمہ عذرا اور عذرا کی واپسی ان کو بہت پسند تھا، ایک مرتبہ میں پرانی کتابوں میں اس کا صاف ستھرا ایڈیشن لے آیا تھا تو بہت خوش ہوئے تھے۔ ہیگرڈ سے دل چسپی اتنی بڑھی کہ اس کی نہ جانے کون کون سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ خاص طور پر ’دی مون آف ازرائیل‘ کا نام لیا کرتے تھے۔

موجودہ زمانے کے جاسوسی ناول یا تھرلز کی طرف انھوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ایک آدھ کتاب مجھ سے لے لی تو پڑھے بغیر ٹال گئے۔ لیکن اس سے پہلے اپنے شوق سے جو کتابیں پڑھ چکے تھے، وہ ان کے حافظے پر جیسے مُرتسم تھیں۔ اپنے خیالوں میں ان کو نہ جانے کتنی مرتبہ

دہراتے رہتے۔

کتابیں جمع کرنے کا شوق وقت کے ساتھ کم ہو گیا۔ کتابیں بانٹنے لگے۔ نئی آنے والی کتابیں باقاعدگی سے بیدل لائبریری بھجوا دیا کرتے، جہاں کے منتظمین نے ان کی دی ہوئی کتابوں کی الگ الماری بنوا دی۔

تازہ ادبی رجحانات اور نئی کتابوں سے ازحد دل چسپی تھی۔ یہاں تک کہ بہت عرصے تک ایک مقبولِ عام رسالے میں نئی کتابوں پر تبصرے کرتے رہے۔ کیوں کہ اس طرح کتابوں سے واقفیت بڑھتی تھی۔ ان کا شوق اور تجسّس آخر تک زندہ بیدار رہا۔

ان کے مزاج میں متانت اور سنجیدگی تھی۔ مگر ایسا بالکل نہیں کہ چیزوں کے لُطف نہ لیتے ہوں، ہلّڑ بازی یا پھکڑّ پن ان کے مزاج سے بہت دور تھے۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ زاہد خشک ہوں۔ دوستوں اور بے تکّلف ساتھیوں کی محفل میں خوب ہنستے بولتے۔ فقرے بازی سے ذرا نہ چوکتے اور اس کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ دوستوں کی محفل ہوتی تو ہزار داستاں کی طرح چہکتے۔

ان کے بے تکلف دوستوں میں معروف شاعر احمد فراز بھی شامل تھے۔ دونوں نے تقریباً ایک ہی ساتھ ریڈیو پاکستان، کراچی میں قدم رکھا تھا۔ فرازؔ صاحب ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو ان کو ''اسلم'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ضیاء الحق کے دور میں طویل جلاوطنی کے بعد فرازؔ صاحب اسلام آباد میں مقیم تھے اور جب بھی میری ان سے ملاقات ہوتی وہ اپنے دوست کی خیریت پوچھا کرتے۔ دن کیسے گزارتے ہیں، شاعری کرتے ہیں؟ وہ مجھ سے پوچھتے۔ ایک مرتبہ میں نے بتایا کہ فرض نمازوں کے علاوہ چاشت، اشراق اور تہجّد کی نمازوں میں بھی ناغہ نہیں ہونے دیتے۔

ان سے کہو کہ نمازیں کم پڑھا کریں، فرازؔ صاحب نے مجھ سے کہا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ بات میں نہیں کہہ سکتا۔ ایسی بات آپ ہی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ طے پایا کہ اگلی بار فرازؔ صاحب کراچی آئیں گے تو میں دونوں دوستوں کی ملاقات کرواؤں گا۔

اس کے بعد جب فرازؔ صاحب کراچی آئے تو میرے ساتھ ابو سے ملنے کے لیے بھی آئے۔ اسلم، سُنا ہے کہ تم نمازیں بہت پڑھنے لگے ہو۔ اس کو کم کرو، فرازؔ صاحب نے چھوٹتے ہی

ان سے کہا۔

میں نے سنا ہے تم شراب بہت پینے لگے ہو۔ اس کو کم کرو۔ ابو نے فوراً جواب دیا۔

اس پر دونوں میں طے پایا کہ وہ شراب کم کردیں گے بشرطے کہ ابو نمازیں کم کردیں۔ معاہدہ طے پا گیا۔ اس کے بعد مجھ سے کہا کہ کمرے سے باہر چلے جاؤ کیوں کہ اب نثر میں گفتگو ہوگی۔

ہشاش بشاش اور خوش باش فرازؔ صاحب اس ملاقات کے بعد جانے لگے تو انھوں نے آہستہ سے مجھ سے کہا، میں نماز کم نہیں کرسکتا لیکن اس کی وجہ سے اس کی شراب کم ہوجائے تو اچھا ہے۔

فراز صاحب کو رُخصت کرنے باہر آیا تو گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے انھوں نے قدرے آہستگی سے کہا، شراب تو کم کیا ہوگی، ان کی نمازیں کم ہوجائیں تو اچھا ہے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ خوش اور مطمئن۔ ابو اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر بہت خوش تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ عمل درآمد کے لیے فرازؔ صاحب کے بھی ویسے ہی ارادے ہیں جیسے آپ کے۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے، مجھے خوب اندازہ ہے۔ میں ہر نماز میں اس کے لیے دعا کروں گا۔ چنانچہ فرازؔ صاحب کا نام انھوں نے دوستوں، واقف کاروں کی اس فہرست میں شامل کرلیا جن کے لیے ہر نماز میں دعا کرتے تھے۔

یہ فہرست پہلے ہی طویل تھی، مگر وہ دعا کے بہت قائل تھے۔ میں جتنی بار بھی ان کے پاس آتا، وہاں سے اٹھ کر اس وقت تک جا نہیں سکتا تھا جب تک کہ وہ حفاظت کی دعا پڑھ کر پھونک نہ دیں۔ اب تم جاسکتے ہو، زیرِلب دعا پڑھنے کے بعد وہ مجھ سے کہتے۔ ان کا یہ معمول اس وقت تک قائم رہا جب تک زندگی کی آخری گھڑیوں میں ہوش و حواس پوری طرح قائم تھے۔ آخری مرتبہ کی دعا کے بعد وہیں رہ گیا، وہ خود اٹھ کر چلے گئے، جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ وہ پہلے چلے گئے تو کیا ہوا۔

ان کی دعاؤں کا حصار مرتے دم تک ٹوٹ نہیں سکے گا۔

مصاحبہ: حمیرا اطہر

ڈاکٹر اسلم فرخی —— ممتاز دانش ور، شاعر، ادیب، نقاد و خاکہ نگار

ڈاکٹر اسلم فرخی ہمہ جہت علمی و ادبی شخصیت اور درس و تدریس کے حوالے سے نابغۂ وقت ہیں۔ وہ ادیب، استاد، محقق، خاکہ نگار، نقاد ہی نہیں بلکہ فی البدیہہ شعر گوئی میں بھی کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو خیاطِ ازل نے لکھنؤ کو اُن کی جنم بھومی کے طور پر سیا لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء میں انھوں نے اپنے وطنِ مامورہ پاکستان کی جانب دوڑ لگا دی کہ خیاطِ ازل کی قینچی اور انگشتانہ انھیں نہ بھایا تھا، سو کراچی آ کے دم لیا گو وطن مالوف ضلع فرخ آباد میں فتح گڑھ تھا۔ انھوں نے "سیج پہ سوئی گوری" "حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حوالے سے چھ کتابیں لکھیں تاہم "دبستان نظام" کو اپنی زندگی کا حاصل قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی چونکہ اپنی خرابیِ صحت اور ضعیفی کے باعث ان دنوں فعال نہیں رہے، لکھنا پڑھنا بھی برائے نام رہ گیا ہے اس لیے موجودہ ادب کے بارے میں رائے دینے سے گریز کرتے ہیں۔ تاہم انھیں گوشہ نشیں اس اعتبار سے قرار نہیں دیا جاسکتا کہ آج بھی ہر اتوار کو باقاعدگی سے صبح گیارہ بجے سے ایک بجے تک ان کے گھر میں ایک محفل سجتی ہے جس میں ان کی نصف بہتر محترمہ تاج فرخی جو خود بھی استاد اور ادیبہ ہیں پیش پیش رہتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں اور انھیں چاہنے والے ادیبوں، شاعروں اور ادب دوست حضرات و خواتین کی خاطر مدارات کا پورا پورا خیال رکھتی ہیں۔ اس محفل میں بے تکلفانہ گفتگو ہوتی ہے جس میں عموماً ڈاکٹر صاحب اپنی گزری زندگی کے واقعات سناتے ہیں۔ بیتی زندگی کا ذکر چھڑ جائے، خواہ ریڈیو کی ملازمت ہو، درس و تدریس کا معاملہ یا ادبی شخصیات کا تذکرہ ہو، اپنی پیرانہ سالی اور ناتوانی کے باوجود بے تکان بولتے ہیں جس کا اندازہ زیرِ نظر گفتگو سے بخوبی ہوتا ہے۔ اُن کی یادوں کے سوتے، جھرنے اپنی راہ خود بناتے چلتے ہیں۔ اسے کسی سانچے میں لانا آسان نہیں۔ لہٰذا میری اُن سے جو گفتگو ہوئی وہ بھی اسی

رنگ میں کہنا مناسب لگتا ہے۔ سو۔۔۔ پڑھیے اور جھرنوں کے بہاؤ خود ہی متعین کرتے جایئے۔

حمیرا: آپ نے ادبی سفر کا آغاز کب اور کیسے کیا، پہلی تحریر کیا تھی؟

ڈاکٹر اسلم: ادبی سفر کے آغاز کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میرا گھرانہ اور میرا خاندان علمی، ادبی ہے۔ میرے پردادا مولوی حسین بخش مصنف تھے۔ پریس کے مالک تھے اور کتابیں چھاپتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے بھی شاعر تھے۔ میرے والد محمد احسن بھی شاعر تھے۔ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی ابوالقاسم وفاؔ فرخ آبادی اچھے شاعر تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وفا بھائی عرصہ دراز تک مولانا تاجور نجیب آبادی کے ساتھ لاہور میں ''ادبی دنیا'' کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور جب آل انڈیا ریڈیو قائم ہوا تو وہاں کام کرنے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ وہ بہت بیمار ہوگئے اور جوانی ہی میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ میری ایک چچازاد بہن بھی شاعرہ تھیں۔ میری والدہ بھی پڑھی لکھی تھیں۔ اگرچہ شعر نہیں کہتی تھیں لیکن پڑھنے لکھنے کا بڑا ذوق تھا اور کتابیں برابر پڑھتی رہتی تھیں۔ تو ایسے ماحول میں جہاں لوگوں کو پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے دیکھا اور سنا تو مجھے بھی شوق پیدا ہوگیا۔ ۱۹۴۱ء میں شعر کہنے کی باضابطہ کوشش کرنے لگا مگر یہ کہ میرا کوئی سامع نہیں تھا۔ ڈرتا تھا کہ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟ میرے والد کے کمرے میں ایک تصویر لگی ہوئی تھی جس میں ایک حسینہ، آنکھوں میں شوخی، ہونٹوں پہ مسکراہٹ، کھڑکی سے جھانک رہی ہے اور نیچے عربی لباس پہنے ایک نوجوان کھڑا اُس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ تصویر ابوالقاسم وفاؔ کے رسالے ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوئی تھی جسے کاٹ کر فریم کروالیا گیا تھا۔ اس کے نیچے اُن کی ایک نظم تھی۔ میں نے بھی اس سے متاثر ہوکر ایک نظم لکھ دی۔ اس کا ایک مصرع تھا:

اک ہنسی ہونٹوں پہ اور نیچی نگاہیں یاد ہیں

اتفاق سے وہ نظم والد صاحب نے دیکھ لی تو میری والدہ سے بولے، ماشاء اللہ! مبارک ہو، آپ کے صاحب زادے شاعر بھی ہوگئے اور عشق و عاشقی کے دائرے میں آرہے ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ ہے۔ پھر انھوں نے وہ نظم دکھائی۔ والدہ نے کہا کہ پہلے اپنے کمرے میں لگی ہوئی تصویر دیکھیے یہ اُسی کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ اس میں عشق و عاشقی کا کوئی معاملہ نہیں۔ یہ سن کر والد صاحب خاموش ہوگئے اور میں شعر کہتا رہا۔ دوسرے شہروں اور قصبوں کی طرح میرے شہر میں

بھی مشاعروں کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں معمر اور نوجوان سب ہی شریک ہوتے تھے۔ یہ محفلیں پہلے تو ہمارے یہاں ہی ہوتی تھیں۔ جب تک ابّا میاں یعنی دادا جان زندہ رہے، گھر میں مشاعرے ہوتے رہے پھر دوسری جگہوں پہ بھی ہونے لگے۔ شہر میں ہر مہینے ایک مشاعرہ ہونا لازم تھا۔ ترقی پسندی کا دور تھا۔ غلام ربّانی تاباں اُس وقت شہر کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اشتراکی نظریات پر ان کا مطالعہ کمال کا تھا۔ وکیل تھے مگر وکالت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ زمینداری کی معقول آمدنی تھی۔ شعر و شاعری اور پڑھنے لکھنے میں وقت گزارتے تھے۔ اُن کے یہاں روزانہ شام کو بیٹھک ہوتی تھی۔ سارے ادیب و شاعر جمع ہوتے تھے۔ ہم بھی جاتے تھے۔ ہم نے اُن لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔ خصوصاً ربّانی صاحب کے خیالات سے۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ ان کے انداز گفتگو، شائستگی، ذوق، ان سب سے تعلق رہا۔ یوں ہم بھی پڑھتے لکھتے رہے، شعر کہتے رہے اور یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں نے اُن سے بڑا اثر قبول کیا یوں کہیے کہ تربیت حاصل کی۔ اس زمانے میں وہاں جو رسالے چھپتے تھے کچھ لکھنؤ سے نکلتے تھے، ہم ان میں اپنی شاعری بھیج دیتے تھے۔ وہ چھپ بھی جاتی تھی، پھر یہ ہوا کہ افسانے لکھنا شروع کر دیے۔ بمبئی کے ایک اخبار ''نظام'' میں جو ترقی پسند تحریک کا ترجمان بھی تھا، تحریک کے جلسوں کی روداد لکھنے لگا۔ اس طرح وہاں کے لوگوں سے بھی واقفیت ہوگئی۔ قدوس صہبائی اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ وہ بھوپال کے رہنے والے تھے اور بھوپال کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اس میں ترقی پسند نوجوانوں کے مضامین و افسانے اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ میری بھی کئی نظمیں اور افسانے شائع ہوئے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ میں سال بھر بمبئی میں رہا۔ وہاں ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں سب سے ملاقاتیں رہیں۔ سب لوگ بڑی محبت سے ملتے تھے۔ علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ظ انصاری، پروفیسر ممتاز حسین اور سجاد ظہیر تھے۔ ایک طرح سے یہ میرا ادبی تربیت کا دور تھا۔ پھر پاکستان بن گیا اور میں ستمبر ۱۹۴۷ء میں یہاں آ گیا۔ یہاں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں آنے جانے لگا۔ پھر شمس زبیری اور راغب مراد آبادی وغیرہ کے ساتھ مل کر ''اردو مرکز'' کے نام سے خود اپنی ایک تنظیم بنالی۔

حمیرا: آپ ریڈیو پاکستان کراچی، تدریس، جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ پھر انجمن ترقی اُردو پاکستان سے وابستہ رہے۔ کچھ ان کی تفصیل بھی بتائیے۔

ڈاکٹر فرخی: پاکستان بنا تو اس وقت مغربی پاکستان میں صرف دو ریڈیو اسٹیشن تھے۔ ایک لاہور اور دوسرا پشاور میں۔ مشرقی پاکستان میں ایک اسٹیشن ڈھاکا میں تھا۔ زیڈ اے بخاری صاحب کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، انھوں نے کراچی میں ریڈیو کے قیام کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے دیا تھا۔ اس وقت کوئنز روڈ (مولوی تمیز الدین خاں روڈ) پر، سمندر کے کنارے جگہ ملی۔ وہاں خیمے لگائے گئے۔ ایک بیرک تھی جس میں اسٹوڈیو بنایا گیا۔ ایک میوزک کے لیے تھا اور ایک تقریروں کے لیے، عملہ خیموں میں بیٹھتا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو اس کا افتتاح ہوا۔

حمیرا: آپ تب ہی اس سے وابستہ ہو گئے تھے؟

ڈاکٹر فرخی: نہیں۔۔۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ اُس وقت ایک ادارہ تھا جس کا نام تھا انجمن ترقی اُردو سندھ یہ ۱۹۱۳ء سے کراچی میں قائم تھا۔ پاکستان چوک پر اس کا دفتر تھا۔ اس کی ایک لائبریری تھی جہاں شام کو لوگ جمع ہوتے تھے اور ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ میں بھی روزانہ اس لائبریری میں جا کر اخبارات اور کتابیں پڑھا کرتا۔ پھر اسی لائبریری کا مہتمم ہو گیا۔ شمس زبیری ریڈیو میں ملازم ہو گئے تھے۔ میں نے ان کا خاکہ بھی لکھا تھا۔

۴ر جنوری ۱۹۴۹ء کو تین بجے کا وقت تھا، میں اُس کتب خانے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک شمس زبیری ہانپتے کانپتے آئے اور بولے، میں تمھارے گھر بھی گیا تھا، تم نہیں ملے تو میں سمجھ گیا کہ تم ضرور یہاں لائبریری میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہو گے۔ بھائی ایک مسئلہ آن پڑا ہے۔ میں نے پوچھا، کیا مسئلہ؟ تو انھوں نے کہا، آج مولانا محمد علی جوہر کی برسی ہے۔ ریڈیو والے چاہتے ہیں کہ شام کو ان کے بارے میں پندرہ منٹ کی تقریر نشر کی جائے۔ اب تقریر لکھے کون؟ میں نے تمھارا نام پیش کر دیا جو منظور ہو گیا۔ اب تم فوراً پندرہ منٹ کی تقریر لکھو اور میرے ساتھ چلو۔ آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ پندرہ منٹ کی تقریر بڑی طویل ہوتی ہے اور اتنی عجلت میں لکھنا آسان بات نہیں ہے۔ بہر حال میں نے سوچا کہ شمس کہہ رہے ہیں تو پھر لکھ دیتا ہوں۔ چنانچہ کاغذ قلم منگایا اور لکھنا شروع کر دیا۔ تقریر مکمل کر کے ہم دونوں نے پاکستان چوک سے دوڑ لگائی اور

بھاگتے ہوئے سمندر کے کنارے کوئنز روڈ پر واقع ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ وہاں نصر اللہ خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے تقریر کا مسودہ دیکھا، بڑی تعریف کی کہ صاحب کمال کر دیا۔ اتنے کم وقت میں اتنی اچھی تقریر لکھ دی۔ وہ تقریر شام کو سات یا ساڑھے سات بجے ریڈیو سے نشر ہوئی۔ بس اس دن سے میرا ریڈیو سے واسطہ ہو گیا۔ بعد میں ہم بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔

حمیرا: وہاں کتنا عرصہ رہے؟

ڈاکٹر فرخی: پانچ سال تک لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو بیان کرنا ضروری ہیں۔ وہاں بڑا اچھا ماحول تھا۔ ادبی ماحول تھا۔ کسی قسم کی کوئی سازش نہیں ہوتی تھی۔ ایک دوسرے سے کوئی حسد نہیں تھا۔ بیر یا بغض نہیں تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی جلن نہیں تھی۔ سب اپنے اپنے کام میں مگن رہتے تھے۔ بڑی محنت اور لگن سے کام کرتے تھے۔ آپس میں کام کا مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ مگر اس میں کوئی برا یا منفی پہلو نہیں ہوتا تھا۔

میں شعبۂ موسیقی سے وابستہ تھا۔ شاہد احمد دہلوی، مدیر ساقی، مشہور ادیب جو موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے۔ شعبۂ موسیقی کے سربراہ تھے۔ کلاسیکی موسیقی پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھیں بخاری صاحب نے سپروائزر کی حیثیت سے رکھا تھا اور ان کا کام یہ تھا کہ وہ ساری چیزیں جو گائی جاتی تھیں، ان کی دُھنیں بنواتے تھے۔ سازندوں سے بات کرتے تھے، ان کی نگرانی کرتے تھے اور وہ یہ سارے کام بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ اس شعبے میں مختلف لوگ تھے جو مختلف کام کرتے تھے۔ مثلاً ارم لکھنوی تھے ان کا کام گانے کے لیے غزلیں منتخب کرنا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی غالبؔ تو کبھی میرؔ کا دیوان پڑھ رہے ہیں۔ وجدؔ چغتائی تھے۔ ان کے ذمے یہ شیڈول بنانا تھا۔ کہ کون سا آئٹم کس وقت نشر ہو گا۔ میرا کام یہ تھا کہ (بعد میں دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے) جو چیز گائی جائے وہ گانے والے کو پہلے پڑھوا دی جائے اور اس سے سن بھی لی جائے۔ نیز گانے کے دوران بھی اسٹوڈیو میں موجود رہا جائے تاکہ کوئی لفظ غلط ادا ہو جائے تو مائیکروفون پر اس کی تصحیح کر دی جائے۔ ریڈیو سے غلط زبان نشر نہیں ہو سکتی تھی۔ میرا دوسرا کام لکھنے کا تھا۔ فیچرز، تقریریں، میوزیکل فیچرز وغیرہ۔ کیوں کہ ریڈیو میں اسٹاف کم تھا لہٰذا سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ تاہم بچپن سے میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ مجھے بڑے ہو کر استاد بننا ہے۔ پھر

ریڈیو میں بھی شاہد احمد دہلوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ دیکھو بھائی! تم ریڈیو میں آ تو گئے ہو، ہم تمھارا خیر مقدم بھی کرتے ہیں لیکن اسے منزل نہ بنانا۔ یہ تمھاری پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ہے۔ اسے تربیت گاہ سمجھو۔ بات کرنا، لکھنا سیکھ جاؤ تو کسی کالج میں کوشش کرنا۔ میں تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔ ہر چند کہ ریڈیو میں مجھے کام کرنے کے لیے بہت مواقع ملے اور وہاں کا ماحول بھی بہت اچھا تھا پھر بھی میں نے ریڈیو میں جو زندگی گزاری، مسافرانہ گزاری، بڑے بوڑھے کہتے تھے، آدمی کمبل چھوڑ دیتا ہے مگر کمبل آدمی کو نہیں چھوڑتا۔ میں نے ریڈیو چھوڑ دیا مگر ریڈیو نے مجھے نہیں چھوڑا۔ ریڈیو چھوڑنے کے باوجود پورے پچیس برس تک ایک معاشرتی و دینی تقریر ہر منگل کی صبح نشر کرتا رہا۔ وہ اسلام آباد سے نشر ہوتی تھی اور سارے اسٹیشن ریلے کرتے تھے۔ ۲۰۱۱ء میں اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے یہ تقریر ترک کر دی تاہم مدتوں ریڈیو والوں کا اصرار جاری رہا کہ پروگرام جاری رکھیے مگر مجھ میں اتنا دم نہیں تھا۔

ریڈیو میں بخاری صاحب آواز کے بادشاہ تھے اور زبان کے بھی بڑے ماہر۔ موسیقی کے بھی بہت بڑے ماہر۔ ایک دفعہ بقر عید کے موقع پر میں نے ایک فیچر لکھا اور اس میں ایک نظم بھی تھی۔

صباح عید بہ ارضِ وطن مبارک باد

اس نظم میں ایک مصرع تھا:

ہر ایک لب پہ ہوئی نغمہ زن مبارک باد

فیچر نشر ہونے کے بعد اتفاق سے اسی دن بخاری صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے دیکھا تو مسکرائے، کہنے لگے، ماشاء اللہ! ماشاء اللہ، آپ تو بڑے اہلِ زبان ہیں۔ کیا زبان لکھتے ہیں، سبحان اللہ، سبحان اللہ، زن مبارک باد۔۔۔ واہ۔۔۔ زن مبارک باد۔

میں نے کہا صاحب میں نے تو لکھا ہے:

ہر ایک لب پر ہے نغمہ فگن مبارک باد

کہنے لگے، اجی! رہنے دیجیے۔ میں ریڈیو والا ہوں، سن کر یاد کر لیتا ہوں۔ پھر بڑی نرمی سے بولے، جو کچھ لکھتے ہو اس پر غور کر لیا کرو۔ اس طرح لکھا کرو کہ کسی کو انگشت نمائی کا موقع

نہ ملے۔ بخاری صاحب نے نہ صرف یہ کہ وہ نظم بڑی توجہ سے سنی بلکہ اس میں جو نقص تھا وہ بھی مجھ پر اس طرح واضح کر دیا کہ مجھے برا بھی نہیں لگا۔ تو یہ سمجھ لیجیے کہ ریڈیو ایک ایسی تربیت گاہ تھی جہاں لوگ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ اصلاح بھی کر دیتے تھے اور احترام بھی کرتے تھے۔

خاری صاحب نت نئے تجربے کرتے رہتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے کہ اسلم! ایسا ہے، روزانہ ایک پروگرام نشر ہو۔ اس کا ابتدائیہ تم لکھو، وسطی حصہ سیلم احمد لکھیں اور اختتام افضل صدیقی کریں گے۔ اب صورت یہ تھی کہ میں تو دوپہر کو واپس آجاتا تھا، سلیم احمد گیارہ بجے ریڈیو آتے تھے اور دن بھر رہتے تھے۔ افضل دفتری اوقات کے پابند تھے۔ یوں ہماری ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی لیکن ہم بھی کچھ کم نہیں تھے۔ ہم تینوں نے یہ طے کیا کہ میں صبح جانے سے پہلے ابتدائیہ لکھ جایا کروں۔ سیلم احمد نے کہا کہ ہم جب گیارہ بجے آئیں گے تو وسطانیہ لکھ کر رکھ دیں گے اور افضل صدیقی نے کہا کہ ہم اس کا ''قلع قمع'' یعنی اختتام کر دیں گے۔ تو صاحب! مدتوں یہ پروگرام چلا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی کہ اس پروگرام کا اسکرپٹ کیسے لکھا جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ آپس میں کیسی ہم آہنگی تھی، کیسی مفاہمت تھی، ایک دوسرے کو کیسا سمجھتے تھے کہ انھوں نے یہ لکھا ہے تو ہمیں اس طرح کہانی آگے بڑھانا چاہیے۔ تو ریڈیو جو تھا وہ ایک بہت بڑا نشریاتی ادارہ تو تھا ہی، نوجوان لکھنے والوں کے لیے ایک بہت بڑی تربیت گاہ بھی تھا۔ صادقین ایک کمرے میں بیٹھے ہیں، مجھے دیکھا تو کہا، ''ارے بھئی اسلم! کہاں جا رہے ہو؟ آؤ بیٹھو یار! چائے پی لو''۔ چائے پینے بیٹھے تو کہنے لگے، تمھیں معلوم ہے کہ ہم اپنی ساری کتابیں ہاتھ سے لکھ لیتے تھے۔ کوئی کتاب خریدتے تھوڑی تھے۔ ہم نے کہا! آپ کے پاس وقت زیادہ ہوتا ہوگا اور اسے ضائع کرنے کی اور کوئی صورت بھی نہیں ہوتی ہوگی۔ تو ہنستے تھے۔ مدنی صاحب (عزیز حامد مدنی) بیٹھے ہوئے ہیں بالکل چپ۔۔۔ مگر اتنے حاضر دماغ تھے کہ کوئی بات ہوتی معلومات کے دریا بہا دیتے۔ اب کیا ان باتوں کو دُہراؤں۔ بس سوچتا رہتا ہوں، غور کرتا رہتا ہوں۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں لکھا ہے۔ پانچ برس میں نے جو ریڈیو میں گزارے، یہ معمول تھا کہ سب اپنا اپنا کام کریں اور زور لگا کر کام کریں۔ سیلم نے کہا، ارے بھئی اسلم! یار ذرا یہ لفظ بتانا، ٹھیک رہے گا؟ میں نے دیکھ کے کہا یہ

اچھا نہیں معلوم ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس جگہ یہ لفظ ٹھیک رہے گا۔ بولے ہاں ---ہاں بالکل ٹھیک، یہی صحیح ہے۔

بہر حال--- ذکر ہو رہا تھا ریڈیو سے شعبۂ تدریس کے سفر کا۔ اُس زمانے میں ایسے کالج برائے نام تھے جن کا بڑا نام ہو۔ اسلامیہ کالج، ڈی جے کالج، سندھ مسلم کالج وغیرہ۔ ان میں بھی نوجوان اساتذہ کے لیے جگہ بہت کم تھی۔ بہر حال----- خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ۱۹۵۵ء میں مجھے سندھ مسلم کالج میں ملازمت مل گئی۔ یوں میں شعبۂ تعلیمات سے منسلک ہو گیا۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ شوق کی ملازمت کا آغاز میری قسمت سے نہیں بلکہ تاج بیگم کی قسمت سے ہوا۔ ۹ اپریل ۱۹۵۵ء کو ہماری شادی ہوئی۔ ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو ان کا سالانہ امتحان تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ امتحان کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ امتحان کے بعد چھٹیاں ہو گئیں۔ دوسرا سیشن شروع ہوا تو مجھے سندھ مدرسہ کالج کے پرنسپل غلام مصطفی شاہ صاحب نے بلایا اور کہا کہ تم ہمارے کالج میں کام کرو۔ چنانچہ میں وہاں پڑھانے لگا۔ غلام مصطفی شاہ وہ آدمی تھے کہ اپنے کالج کے اساتذہ اور طالب علموں پر جان دیتے تھے۔

وہاں ریاضی کے ایک استاد ہوا کرتے تھے اطہر حسین، شیروانی پہنتے تھے، علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ وہ نہ جانے کیوں یہ جو اشتیاق طالب بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے ناراض ہو گئے۔ اشتیاق طالب آج کے نہیں اُسی زمانے کے شاعر ہیں اور طالب علموں کے مقبول شاعر تھے جگہ جگہ شعر پڑھتے تھے۔ بہر حال اطہر حسین نے قسم کھالی کہ ان کے پرچے میں اشتیاق طالب کبھی کامیاب نہیں ہونگے۔ یوں انھوں نے ان کے دو برس ضائع کرادیئے۔ جب وہ وہاں سے چلے گئے تب اشتیاق طالب کامیاب ہوئے۔ یہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہے ورنہ سندھ مسلم کالج کا ماحول تو اتنا اچھا تھا کہ کیا بتاؤں۔ مسیح الدین صدیقی انگریزی اور چوہدری اظہار محمد اُردو پڑھاتے تھے۔ چوہدری اظہار محمد سندھ مدرسہ میں ہی رہتے تھے۔ صبح کو دیر سے اٹھتے اور کالج میں دوڑتے ہوئے آتے تھے۔ انھیں روزانہ دیر ہو جاتی تھی پھر ان کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی دیر سے آنے لگے۔ غلام مصطفی شاہ--- آپ کو کیا بتاؤں، کیا آدمی تھے وہ--- صاحب! جب انھوں نے یہ دیکھا کہ لوگ دیر سے آنے لگے ہیں تو کالج صبح آٹھ بجے لگتا تھا، وہ سات بج کر پچاس منٹ پر اخبار لے

کر آتے اور اسٹاف روم کے دروازے کے سامنے بیٹھ جاتے۔ نہ کسی سے بولنا، نہ چالنا۔ سلام، وعلیکم السلام۔ سوا آٹھ ہوئے اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جند ہی دنوں میں سب لوگ وقت پر آنے لگے۔ انھوں نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا کہ بھئی تم دیر سے کیوں آتے ہو؟ کیا بات ہے، تم روزانہ دوڑتے ہوئے کیوں آتے ہو؟

ان کا ایک اور واقعہ سن لیں۔ عقیل دانش نے گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے فرسٹ کلاس بی اے کیا اس کے بعد کراچی یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا۔ اب انھیں ملازمت کی فکر ہوئی۔ میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد ہی میں تھا اور غلام مصطفی شاہ صاحب ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے۔ عقیل نے اِدھر اُدھر بہت درخواستیں دیں مگر کہیں سے کچھ نہیں ہوا تو ایک دن بڑے روہانسے ہو کر مجھ سے بولے کہ کہیں نوکری نہیں مل رہی ہے۔ میں نے کہا، چلو غلام مصطفی شاہ صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ کالج کے سامنے سے بس میں بیٹھے اور سعید منزل پہ اتر کے ڈائریکٹر ایجوکیشن کے دفتر پہنچ گئے۔ ان کا پی اے کہنے لگا کہ آج شاہ صاحب کسی سے نہیں ملیں گے، انھیں کہیں جانا ہے۔ تم لوگ کل آنا۔ میں نے کہا اچھا ٹھیک ہے ہم واپس پلٹنے ہی تھے کہ شاہ صاحب اپنے کسی مہمان کو چھوڑنے کے لیے باہر آئے۔ ہمیں دیکھا تو کہنے لگے، ارے تم کہاں۔۔۔ اتنے دنوں بعد کیوں آئے؟ میں نے کہا، آپ بھی جب دیکھ لیں تو اسی طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں، کام تو کوئی کرتے نہیں، کہنے لگے کیا ہو گیا؟ میں نے کہا یہ لڑکا گورنمنٹ کالج سے فرسٹ کلاس بی اے اور اردو میں فرسٹ کلاس ایم اے ہے۔ ہمارے کالج میں جگہ ہے پھر بھی اسے ملازمت نہیں ملتی۔ یہ سنتے ہی پی۔اے سے کہا، مہر علی کو بلاؤ۔ مہر علی برانچ کے انچارج تھے۔ وہ آئے تو کہا، مہر علی! گورنمنٹ کالج میں جگہ ہے پھر اس لڑکے کو ملازمت کیوں نہیں ملی؟ اس کا نام لکھو اور اپائمنٹ لیٹر لے کے آجاؤ۔ مجھے جانا ہے، جلدی کرو اور مجھ سے دستخط کرالو۔ تو صاحب! مہر علی اپائنٹ منٹ لیٹر لائے۔ شاہ صاحب نے دستخط کیے اور ہم سے کہا۔ یہ لو اور جاؤ بھاگو۔ جب شاہ صاحب چلے گئے تو مہر علی نے ہم سے کہا کم از کم اس کے لیے ایک درخواست تو لکھ دو۔ چنانچہ وہیں بیٹھے بیٹھے درخواست لکھ کر انھیں دے دی گئی۔ تو شاہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ جو کام ہو سکتا ہے وہ فوراً کر دو ورنہ منع کر دو، آسرے میں نہ رکھو۔

ایک مرتبہ میں ایک مسئلے میں الجھ گیا۔ بڑا پریشان ہوا۔ تب بھی غلام مصطفی شاہ ہی کام آئے۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ میری بھتیجی لالوکھیت دس نمبر میں رہتی ہے تم وہاں کے گورنمنٹ اسکول میں اس کا داخلہ کرادو۔ میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں پڑھاتا تھا۔ دل میں سوچا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے۔ میں لالوکھیت گیا، اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے ملا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں بھی تعلیمات کا آدمی ہوں، چاہتا ہوں کہ اس بچی کو یہاں داخلہ مل جائے۔ انھوں نے ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالی۔ بڑی رعونت سے بولیں، جس کا جی چاہتا ہے وہ اٹھ کر چلا آتا ہے کہ میں تعلیمات کا آدمی ہوں۔ مجھے غصہ تو بہت آیا پھر بھی اپنی طبیعت کے خلاف میں نے بڑی نرمی سے بات کی۔ آخر کار جب انھوں نے سختی سے کہا کہ آئندہ آپ یہاں نہ آیئے گا تو میرا فرخ آبادی حرارہ جو تھا وہ نمایاں ہوگیا اور میں نے کہا ''اچھا'' یہ کہہ کے وہاں سے نکلا اور بس میں بیٹھ کر سیدھا سعید منزل اترا۔ شاہ صاحب کے پاس پہنچا۔ انھوں نے کہا کیا بات ہے، اس قدر غصے میں کیوں ہو؟ میں نے کہا صاحب! اب ہماری یہ عزت رہ گئی ہے کہ دو دو ٹکے کی ہیڈ مسٹریس ہمیں ڈانٹتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آئندہ یہاں آؤ گے تو ہم باہر پھنکوا دیں گے۔ شاہ صاحب نے پوچھا، کیا بات ہے، ہوا کیا ہے؟ ہم نے بات بتائی تو انھوں نے ایک سلپ نکالی اور لکھا، ''ہیڈ مسٹریس، گورنمنٹ گرلز اسکول، لالوکھیت نمبر دس ADMIT غلام مصطفی شاہ''، وہ ہمیں دے کر کہا کہ جاؤ یہ اسے دے دو۔ میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھا اور واپس لالوکھیت دس نمبر کے اسکول میں پہنچا۔ ہیڈ مسٹریس میری صورت دیکھتے ہی آپے سے باہر ہوگئی اور بولی، میں نے آپ کو منع کر دیا تھا۔ آپ پھر آگئے؟ میں نے کہا میں داخلے کے لیے نہیں آیا۔ میں تو اس لیے آیا ہوں کہ غلام مصطفی شاہ صاحب نے آپ کے لیے یہ لکھ کر دیا ہے کہ اگر آپ کے یہاں داخلہ نہیں ہے تو لکھ کر دے دیں۔ میں یہ کاغذ دکھا کر کہیں اور داخلہ کرادوں گا۔ کاغذ دیکھتے ہی، پانی کی طرح بہہ گئیں۔ بالکل پانی کی طرح --- ارے صاحب بیٹھئے بیٹھئے۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں نے کہا کہ پہلے میں کیا جھک مار رہا تھا؟ آپ کو بتایا تو تھا کہ میں بھی استاد ہوں، گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں، کہنے لگیں، خیر --- اب یہ داخلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ فلاں --- چائے لے کر آؤ پروفیسر صاحب کے لیے۔ تو صاحب! یوں داخلہ ہوگیا۔ آپ غور کیجیے کہ غلام مصطفی شاہ صاحب کیا آدمی تھے۔

آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر میں جو آج بھی انھیں یاد کرتا ہوں تو یہ ان کی محبت ہی ہے۔ ان کے بڑے پن کے لیے یاد کرتا ہوں۔

گورنمنٹ کالج میں اساتذہ ترجیحی بنیادوں پر رکھے جاتے تھے۔ ان میں بنگالی نوجوان زیادہ تھے۔ مغربی پاکستان کے کم تھے۔ مگر صاحب میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ وہ جو بنگالی اساتذہ تھے وہ کوئی فرق نہیں رکھتے تھے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک خاندان ہے۔ آپس میں شرارتیں بھی کرتے تھے۔ بعد میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر بھی پہنچے مگر ان میں ذرا بھی تعصب نہیں تھا۔ وہاں ایک ڈیمانسٹریٹر تھا۔ اس نے سی ایس پی کا امتحان دیا تھا اور پبلک سروس کمیشن کے رکن کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ اسی طرح محمد حسن تھے انگریزی پڑھاتے تھے۔ لالوکھیت میں رہتے تھے۔ انھوں نے سی ایس پی کا امتحان دیا اور سندھ گورنمنٹ میں فنانس سیکریٹری ہوگئے۔ ایک علیم شیخ تھے وہ انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ جج ہوگئے مگر یہ کہ جب یہ لوگ بڑے عہدوں پر پہنچ گئے تو میں ان سے کبھی ملنے نہیں گیا۔

حمیرا: کیوں؟

ڈاکٹر فرخی: میں نے ان سے ملنے کا کوئی تصور ہی نہیں کیا۔ ایک مرتبہ میں حیدرآباد گیا تو علیم ڈپٹی کمشنر تھے۔ میرے ساتھ ایک وکیل صاحب تھے۔ وہ بولے یہ بھی گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں تھے۔ آپ انھیں جانتے ہیں؟ میں نے کہا، جاننا کیا۔۔۔ یہ لڑکا تھا اس وقت ۔۔۔ انھوں نے کہا، چلیں آپ کے ذریعے میں بھی مل لوں گا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ نہیں صاحب! میں اسے سلام کرنے نہیں جاؤں گا۔ دراصل یہ میری استادانہ انا کے خلاف تھا۔ میں محبت سے اسے ملنے جاتا اور وہ سمجھتا کہ کسی کام سے آیا ہوں۔ البتہ جو خود آکر مجھ سے ملتے تھے میں ان سے ضرور ملتا تھا۔ سبطین تھے، بہت دن سادات امروہہ کے سیکریٹری بھی رہے۔ انکم ٹیکس آفیسر، انکم ٹیکس کمشنر رہے۔ ان سے ملنا جلنا تھا۔ وہ میرے یہاں آتے تھے اور میں ان کے یہاں جاتا تھا۔ کوئی عار نہیں تھا۔ لیکن بھائی! جب وہ کالج سے نکل گئے اور بڑے ہوگئے تو پھر ہم ان کے پاس جاکر کہیں کہ حضور! ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ یہ ہم سے نہیں ہوتا اور ہم نے کبھی نہیں کیا۔ تو یوں گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں دس سال گزارنے کے بعد کراچی یونی ورسٹی میں ملازمت مل گئی۔

وہاں ایک لمبا عرصہ گزارا اور وقت گزر گیا۔

حمیرا: یونی ورسٹی میں آپ شعبۂ تصنیف و تالیف میں بھی تو تھے؟

ڈاکٹر فرخی: ہاں۔۔۔ میں وہاں شعبۂ تصنیف و تالیف کا ناظم ہو گیا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ یونی ورسٹی میں لوگ کتابیں لکھنے پر تیار نہیں تھے۔ بس میجر آفتاب حسن جو کام کر گئے، سو کر گئے۔ اس کے بعد میں لاکھ سر پٹخا کیا، شعبۂ تصنیف و تالیف میں کوئی کام نہیں ہو سکا۔

حمیرا: ایسا کیوں ہوا جب کہ اس شعبے کے لوگوں کا تو کام ہی پڑھنا لکھنا تھا؟

ڈاکٹر فرخی: میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب میں اردو یونی ورسٹی میں شعبۂ تصنیف و تالیف کا ناظم تھا تو ملک کی مختلف یونی ورسٹیز کا دورہ کیا۔ وہاں کے وائس چانسلروں کی مہربانی سے اساتذہ کو جمع کیا اور ان سے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے کتابیں لکھیں۔ میری ساری گفتگو سننے کے بعد ایک صاحب نے کہا، ہمیں کیا تکلیف ہے کہ ہم آپ کے لیے کتاب لکھیں؟ ہم کوچنگ سینٹرز ہی میں کیوں نہ پڑھائیں جہاں سے ہمیں لاکھ روپے ماہانہ ملیں۔ ہم آپ کے لیے کتاب لکھ کر بلاوجہ کیوں وقت ضائع کریں؟ میں نے کہا، آپ نے بالکل درست فرمایا۔ میں نے ہی یہاں آکر جھک ماری ہے۔ تو یہ رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ اب آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔ معدودے چند لوگ ہوتے ہیں جو کتابیں لکھتے ہیں۔ باقی سب کم وقت میں زیادہ پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔ کراچی یونی ورسٹی میں ایک استاد تھے جو وائس چانسلر کے گھر کا سودا لاتے تھے۔ ایک صاحب تھے جو رجسٹرار کی بیوی کا قارورہ روزانہ ٹیسٹ کے لیے یونی ورسٹی سے جناح اسپتال لے جاتے تھے۔ ایک اور صاحب تھے وہ کلاس لینے کے بعد باقی وقت میں ٹیکسی چلاتے تھے۔ مگر ریڈیو میں یہ نہیں تھا اور گورنمنٹ کالج میں بھی ایسا نہیں تھا۔

حمیرا: آپ نے انجمن ترقیِ اردو پاکستان میں بھی تو کام کیا؟

ڈاکٹر فرخی: ہاں! یونی ورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد سوچا تھا کہ اب کوئی کام نہیں کروں گا۔ مگر سبک دوش ہونے سے پہلے ہی انجمن ترقیِ اردو سے پیغام آیا کہ گھر بیٹھ کر کیا کرو گے؟ یہاں آکر کام کرو۔ میں نے بہت منع کیا لیکن پھر ہتھیار ڈالنے پڑے اور انجمن میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہاں ادب کے مشاہیر کو بلانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کو بلایا، ڈاکٹر اختر حسین رائے

پوری کو بلایا، ڈاکٹر آفتاب کو بلایا، ڈاکٹر غلام حسین شاہ کو بلایا۔ وہاں خاصہ کام کیا۔ وہاں بھی دس سال گزارے اور بڑے مزے مزے کے واقعات ہوئے۔ آپ نے بچوں کی ایک مشہور کتاب کا نام سنا ہو گا، ”ایلس اِن ونڈر لینڈ“۔ یہ وہ کتاب ہے جو دنیا کی ہر زبان میں لکھی گئی اور ہر ملک میں مقبول ہوئی۔ آسٹریلیا نے اس حوالے سے ایک میوزیم بنایا تو دنیا کے مختلف ممالک کو خط لکھا کہ اگر آپ کے ملک کی زبان میں یہ کتاب ترجمہ ہوئی ہو تو ہمیں اس کا ایک نسخہ بھیجئے۔ ہم اسے اپنے میوزیم کی لائبریری میں رکھیں گے۔ وہ خط وزارتِ تعلیم میں بھی آیا۔ انھوں نے اپنے سر سے بلا اتارنے کی خاطر انجمن میں بھیج دیا۔ مقصد یہ تھا کہ معذرت کا خط لکھ دیں کہ ہمارے یہاں کہاں ”ایلس اِن ونڈر لینڈ“ کا تصور ہے۔ وہاں ایک یحییٰ خان تھے، میں نے ان سے کہا، آپ کو تو کچھ علم ہی نہیں ہے۔ پوچھا، کیا مطلب؟ میں نے کہا، ہمارے یہاں ایک وزیرِ تعلیم گزرے ہیں جن کا نام محمد افضل تھا۔ کہنے لگے ہاں پھر؟ میں نے کہا کہ وہ کتاب ان کو بہت پسند تھی تو انھوں نے ایک پروجیکٹ بنایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس کتاب کا بہت اچھے ادیبوں سے ترجمہ کرایا جائے۔ سو اس کا ترجمہ کرایا گیا اور بڑی اچھی طرح شائع کیا گیا۔ میری بات پر اس کی تلاش شروع ہوئی تو گودام سے اس کے بنڈل کے بنڈل نکل آئے۔

انجمن کی ملازمت کے دوران بڑا سخت حملہ میرے قلب پر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ میں بچ گیا۔ کچھ دن آغا خان اسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ پھر میں نے انجمن کی ملازمت ترک کر دی اور گھر میں ہی پڑھتا لکھتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد وفاقی اردو یونی ورسٹی سے وابستہ ہو گیا جہاں نصاب کے لیے سائنسی موضوعات پر اردو میں کتابیں ترجمہ کرا کے شائع کراتا رہا۔ اس طرح ۷۰ کتابیں شائع کرائیں پھر گھر بیٹھ گیا، صحت بھی خاصی خراب ہو گئی۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ میں نے اردو یونی ورسٹی سے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ چائے بھی اپنی پیتا تھا۔ اپنی جیب سے دودھ اور پتی منگاتا تھا اور چائے بنواتا تھا۔ اب یہ ہے کہ بیماریوں میں گھرا ہوا ہوں۔ سماعت اور بصارت جواب دیتی جارہی ہے۔ زیادہ تر گھر میں رہتا ہوں۔ پڑھنا لکھنا بھی برائے نام رہ گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہر اتوار کو میرے کچھ شاگرد اور ادب دوست آجاتے ہیں تو ان سے گپ شپ ہو جاتی ہے۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔

حمیرا: آج کا دور خود نمائی اور تعلقات کا دور ہے جس میں ادیب و شاعر بھی بری طرح مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر فرخی: کسی معاشرے کا جو مزاج ہوتا ہے وہی ادیب اور شاعر کا ہوتا ہے۔ یہ اپنے معاشرے سے کوئی الگ مخلوق تو نہیں ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ادیب اور شاعر معاشرے کو تہذیب اور اقدار کی بلندی پر لے جانا چاہتا ہے۔ اس کی اصلاح چاہتا ہے، اس کی تزئین و آرائش چاہتا ہے مگر یہ کہ وہ بھی اسی ماحول کا حصہ ہیں۔ ان کی بھی ضروریات ہیں۔ انھیں بھی کھانے کے لیے روٹی اور پہننے کے لیے کپڑے درکار ہوتے ہیں۔ وہ محض افسانے لکھ کر یا شاعری کر کے زندگی نہیں گزار سکتے۔ دوسری بات یہ کہ انھیں نظر انداز بھی کیا جاتا ہے۔ جب آپ نے خود ہی کہا کہ آج کا دور خود نمائی اور تعلقات کا دور ہے تو پھر شاعر اور ادیب کا خود نمائی اور تعلقات کا رویہ بھی کسی حد تک گوارا اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو سچے ادبی کام کرتے ہیں وہ خود نمائی سے بچتے ہیں۔ آپ غور کیجیے حسن منظر اور اسد محمد خان دونوں کتنے بڑے ادیب ہیں، اردو افسانے کے لیے باعثِ فخر ہیں مگر دونوں ہی بڑے سادہ اور منکسر المزاج ہیں۔ اسی طرح شاعروں کو دیکھیے۔ رساؔ چغتائی اپنی ہی ذات میں گم ہیں۔ انورؔ شعور کو دیکھیے، کیا ان میں خود نمائی کا رویہ نظر آتا ہے؟ کیا ان کی کوئی لابی ہے؟ کیا یہ مشاعروں کے پیچھے دوڑتے ہیں؟ کسی نے بلا لیا تو چلے گئے، ورنہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کیا یہ متوازن اور عمدہ زندگی گزار رہے ہیں؟

حمیرا: نہیں۔۔۔ میری مراد نئی نسل سے ہے اس میں یہ رجحان زیادہ ہے۔

ڈاکٹر فرخی: ترقی کرنے کی خو بہت اچھی ہے مگر اس کے لیے محنت کرنا چاہیے۔ ان کو ابھی اپنی شناخت کرانی ہے اور اس کے لیے موجودہ دور میں جو طریقے رائج ہیں یہ بھی انھیں اختیار کرنے ہیں۔ تاہم شناخت بہت مشکل سے بنتی ہے۔ یہ آسان بات نہیں ہے۔

حمیرا: آپ نے شیخ نظام الدین اولیاؒ اور تصوف پر چھ کتابیں مرتب کی ہیں۔ تصوف کی جانب رجحان کیسے پروان چڑھا؟

ڈاکٹر فرخی: یہ رجحان مجھے بچپن میں اپنے نانا سے امانت کے طور پر حاصل ہوا۔ میرے نانا بلکہ پورے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا چلن تھا۔ میرے دادا، نانا، پرنانا بھی اپنے پریس میں کتابیں

چھاپتے تھے۔ میرے نانا کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ میں ان کی بڑی بیٹی کا پہلا بیٹا تھا تو نانا میری پیدائش پر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اس کو ہم پالیں گے۔ تو میں لکھنؤ میں رہا اور وہاں ان کے زیرِ سایہ تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے گھر آگیا۔ نانا کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ جہاں جاتے تھے، مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ میں دیوے، کچھوچھے گیا، ردولی گیا، بہرائچ گیا۔ اسی طرح نانا کے ساتھ ایک بزرگ، مولانا فضل الرحمن مراد آبادی کے آستانے پر جاتے تھے۔ میں نے ان بزرگ کو نہیں دیکھا مگر میرے بزرگوں نے دیکھا ہے۔ اسی طرح یہ چیز میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا وہ عقیدت بھی توانا ہوتی گئی اور اتنی توانا ہوگئی کہ میں نے امیر خسرو کا مطالعہ کیا اور اس حوالے سے حضرت نظام الدین اولیاؒ میرے مطالعے اور میرے ذوق و شوق اور عقیدت کا مرکز بن گئے۔ اُن کے بارے میں مجھے اردو، انگریزی اور فارسی میں جو کچھ بھی لکھا ہو ملا، میں نے پڑھ ڈالا۔ میں بے شمار مرتبہ اُن کے عرس میں بھی شریک ہوا اور کئی مرتبہ ذہنی اور روحانی تجربات سے گزرا۔ یہاں تک کہ اُن پر ایک خاکہ ''نظام رنگ'' لکھ ڈالا۔ اسی طرح تصوف سے لگاؤ ہونے کا دوسرا ذریعہ میرے پیر و مرشد اور میرے استادِ مکرم ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب بنے۔ مجھے ان کی شاگردی پر فخر ہے اور میں آج جو کچھ بھی ہوں، اُن کی روحانی تربیت سے ہوں۔ کیا بزرگ تھے۔ میری زندگی پر اُن کا بڑا گہرا اثر ہے۔ پہلے میں نماز نہیں پڑھتا تھا، روزہ نہیں رکھتا تھا اور شریر آدمی تھا کہ جو منھ میں آیا کہہ دیا۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب کلاس لے رہے تھے گرمی بہت تھی تو میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب! آج گرمی بہت ہے، پڑھائی نہیں کچھ اور ہونا چاہیے۔ کہنے لگے کیا ہونا چاہیے؟ میں نے کہا آپ ہم لوگوں کو لسّی پلوائیے۔ بولے اچھا۔ وہ روپئے شیروانی کی اندرونی جیب میں رکھتے تھے۔ وہاں سے روپئے نکالے اور چپراسی کو بلا کر کہا، جاؤ سب کے لیے لسّی لے آؤ۔ لسّی آئی اور ہم نے پی لی تو کہا، سر! کلاس کا وقت ختم ہو گیا۔ بولے ہاں اور کلاس برخاست ہوگئی۔ تو میں جب کبھی ان کے یہاں جاتا، معلوم ہوا کہ مغرب کا وقت ہے، وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں انتظار میں بیٹھ جاتا۔ کبھی انھوں نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے، روزہ کیوں نہیں رکھتے؟ بس ایک دن میرے دل میں آیا کہ مجھے بھی نماز پڑھنی چاہیے۔ تو میں گیا اور ان کی امامت میں نماز پڑھ لی۔ اس وقت تو انھوں نے کچھ نہیں کہا بعد میں خوشی کا

اظہار کیا۔ تو ایک طاقت تھی جو میرا رخ موڑ رہی تھی اور وہ ڈاکٹر شاہ تھے۔ جنھوں نے مجھ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھوا دیا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں بڑا نیک ہو گیا لیکن میں تصوف کی طرف ضرور مائل ہو گیا اور اس طرح مائل ہوا کہ پھر اسی کا ہو کے رہ گیا۔

حمیرا: پاکستان میں شاعری یا نثری ادب ذریعۂ معاش کیوں نہیں بنتا؟ حالانکہ اطلاعات کے مطابق بھارت میں مادّی اور تہذیبی وسائل ہم ہی جیسے ہونے کے باوجود ذریعۂ معاش ہیں اور مستحکم بھی ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر فرخی: پاکستان میں بھی ذریعہ معاش بنتا تو ہے۔ اخباروں میں شعرا قطعات لکھتے ہیں کیا وہ ذریعہ معاش نہیں ہوتا؟ احمد ندیم قاسمی ادب ہی کے بل بوتے پر زندگی گزارتے رہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ خود ننگے ہوں تو دوسروں کو کیا کپڑے پہنائیں گے۔ اب صحافت میں ادب بھی مل گیا۔ اب بہت سے ادیب ایسے ہیں جو صحافت سے بھی وابستہ ہیں اور وہ ان کا ذرائع معاش ہے جب کہ بہت سے ادیب ایسے ہیں جو ادب کو اپنے شوق کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ تو دو قسم کے ادیب و شاعر ہیں۔ ایک وہ جو ادب و شعر کو اپنے معاش کا ذریعہ بھی بناتے ہیں اور دوسرے وہ جو اسے معاش کا نہیں صرف اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔

حمیرا: مگر یہ دیکھیں ناں! آج کل اخبارات اور ادبی رسائل میں لکھنے والوں کو معاوضہ دینے کا رجحان نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرخی: ادبی رسائل بھی تو دیکھیں کہ بکتے نہیں ہیں۔ ان کی اپنی مالی حالت کیا ہوتی ہے؟ نہ انھیں اشتہارات ملتے ہیں نہ وہ رسالے اور کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کا نہ کوئی عملہ ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص سارے کام کرتا ہے۔

حمیرا: یہی تو میرا سوال ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے جبکہ ہندوستان میں ایسا نہیں ہے؟

ڈاکٹر فرخی: وہاں بھی ایسا ہی ہے۔ وہاں بھی زیادہ تر رسالے ایسے ہی ہیں جو معاوضہ نہیں دیتے۔ البتہ وہاں مشاعرے بہت ہوتے ہیں اور مشاعرے کرانے والے چونکہ صاحب ثروت ہوتے ہیں لہٰذا وہ شاعروں کو بھی معاوضہ دیتے ہیں۔

حمیرا: علمی سطح پر آپ کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ ''محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف''

مانا جاتا ہے جس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی ملی۔ اس موضوع کا انتخاب کس نے کیا تھا اور کس کی نگرانی میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا؟

ڈاکٹر فرخی: سب سے بڑا کارنامہ ہے ”دبستانِ نظام“ یہ موضوع کی نسبت سے بہت انوکھا کام ہے۔ پانچ سو صفحات کی یہ کتاب اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ صرف بہت بڑے بزرگ ہی نہیں بلکہ بہت بڑے عالم، بہت بڑے مفکر، ادب کا بہت بڑا خزینہ اور بہت بڑے ادب دوست بھی تھے۔ چنانچہ ان کی بارگاہ سے جو لوگ اٹھے اور جنھوں نے وہاں تربیت حاصل کی وہ دنیائے شعر و ادب میں غیر معمولی شہرت کے حامل ہوئے۔ مثال کے طور پر حضرت امیر خسروؒ، خواجہ حسن سجزیؒ جنھوں نے حضرت کے مکتوبات ”ملفوظاتِ فوائد الفواد“ کے نام سے مرتب کیے اور بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کا بہترین نمونہ فراہم کر دیا۔ تو مجھے یہ خیال آیا کہ صوفیائے کرام کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ان کے عقیدت مندوں اور مریدوں کے بارے میں تو اظہار خیال کیا گیا ہے لیکن اس نقطۂ نظر سے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی کہ یہ لوگ اپنے دور میں بڑے عالم اور اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے ایک پورا باب اس حوالے سے تحریر کیا۔ ”مشارق الانوار“ میں کوئی پانچ ہزار احادیث ہیں جو حضرت کو زبانی یاد تھیں اور کیفیت یہ تھی کہ ادھر کسی نے کوئی حدیث شروع کی اور حضرت نے وہ پوری بیان کر دی۔ شعر و سخن پر مہارت کا یہ عالم تھا کہ ادھر کسی نے مصرع پڑھنا شروع کیا اور آپ نے پورا شعر پڑھ دیا۔ اتنا عبور تھا اس پر کہ وہ اپنے عہد کے عدیم النظیر استاذ الاساتذہ تھے۔

اس کتاب کو لکھنے میں مجھے تقریباً تین سال لگے۔ میں نے اس کا پہلا صفحہ لکھا تھا حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر اور آخری صفحہ لکھا مدینہ منورہ میں۔ میں وہاں بیٹھ کر لکھتا تھا اور جو گزرتا تھا وہ حیرت سے مجھے دیکھتا تھا کہ یہ کون پاگل ہے کہ سب دعائیں مانگنے میں مصروف ہیں اور یہ بیٹھا لکھ رہا ہے۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرا کوئی کارنامہ ہے تو یہ کتاب ہے۔ جہاں تک محمد حسین آزاد کے بارے میں لکھی گئی کتاب کا تعلق ہے تو وہ ایک تحقیقی کتاب ہے۔ لوگوں نے پسند کیا، توصیف کی جس سے حوصلہ ملا۔ آج تک اس کتاب پر اضافہ نہیں ہو سکا۔ اسے ۱۹۶۵ء میں داؤ ادبی ایوارڈ ملا۔ جس کے ساتھ پانچ ہزار روپے نقد انعام بھی تھا۔ اس وقت

اس ایوارڈ کے لیے بڑا سخت مقابلہ ہوا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں اسے آدم جی ادبی ایوارڈ ملا۔ اس کی تقریب تقسیم انعامات ڈھاکہ میں ہوئی تھی تو میں اسے لینے ڈھاکہ گیا تھا۔ اس کتاب کے لیے موضوع کا انتخاب میرا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی چونکہ صدر شعبۂ اردو تھے، لہٰذا یہ مقالہ ان ہی کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مقالے کو لکھتے ہوئے میں محمد حسین آزاد میں ڈوب گیا تھا۔ ان کی شخصیت، ان کا خاندان۔۔۔ لوگ ان کے بارے میں مجھ سے پوچھتے تھے۔ ایک دن ان کے پڑپوتے سلمان یہاں آئے۔ بعد میں انھوں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم ہی بڑے آزاد شناس ہیں مگر یہ تو ہمارے بھی چچا نکلے۔

جنوری ۲۰۱۰ء میں گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور میں محمد حسین آزاد کی صد سالہ برسی منائی گئی تو مجھے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا۔ میں نے سوچا، آزاد پر دو جلدوں کی اتنی ضخیم کتابیں تو لکھ چکا، اب اس موقع کے لیے کیا لکھوں؟ تو میں نے لکھنا شروع کیا۔ میرے لکھنے کا انداز یہ ہے کہ جب لکھتا ہوں تو پھر لکھے چلا جاتا ہوں، قلم رکتا نہیں، تو لکھتے لکھتے میں نے کتاب ''نگارستانِ آزاد'' مرتب کر دی۔ وقت بہت کم تھا لہٰذا میں صبح سے شام تک اور شام سے رات تک بس لکھتا ہی رہتا تھا۔ میں نے محمد حسین آزاد کا خاکہ لکھا۔ وہاں جب وہ خاکہ پڑھا گیا تو اس کے آخری حصے کو سن کر عورتیں اور مرد سب روئے۔ وہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ اب میرے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ محفوظ نہیں۔

حمیرا: آپ نے بچوں کے ادب کے حوالے سے بہت کام کیا۔ اس بارے میں کچھ تفصیل بتائیے، کتنی کتابیں شائع ہوئیں؟ بچوں کا ایک رسالہ ''میرا رسالہ'' بھی نکالا کرتے تھے۔ کچھ اس کی تفصیل بھی بتائیے۔

ڈاکٹر فرخی: بہت تو نہیں، معمولی کام کیا۔ پہلا کام کراچی میں بچوں کا پہلا رسالہ شائع کرنا تھا۔ ''میرا رسالہ'' کراچی میں بچوں کا پہلا رسالہ تھا۔ چار آنے اس کی قیمت تھی۔ کتابی سائز میں ہوتا تھا۔ یہ بہت عرصہ تک نکلا۔ بس جان پہچان والوں سے فرمائش کر کے لکھوا لیتا تھا۔ ہم نے اچھے اچھے لکھنے والوں سے جبراً لکھوایا۔ پھر میں نے اسے اپنے چھوٹے بھائی انور احسن صدیقی کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے اسے بڑی کامیابی سے چلایا پھر اپنا ایک رسالہ ''لوح و قلم'' طالب علموں کے لیے نکالا تو

''میرا رسالہ'' بند کر دیا۔ وہ بھی اپنی نوعیت کا پاکستان میں طالب علموں کے لیے پہلا رسالہ تھا مگر اس کو حکومت کی نظر کھا گئی، وہ ضبط ہو گیا۔

حمیرا: آپ نے بہت سے لوگوں کے خاکے بھی لکھے جو تین کتابوں ''گلدستۂ احباب''، ''آنگن میں ستارے'' اور ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' میں محفوظ ہیں۔ آج کل جو لوگ خاکہ نگاری کر رہے ہیں ان میں کوئی اہم نام؟

ڈاکٹر فرخی: اس کے بعد ''موسم بہار جیسے لوگ'' ہے اور اب ایک مجموعہ اور تیار ہو گیا ہے جس کا نام زیر غور ہے۔ انور کا جب انتقال ہوا تو میں نے اپنے آپ پر لعنت ملامت کی کہ ساری دنیا کے خاکے لکھ دیئے اور اپنے بھائی کا جو ساری زندگی، ساری دنیا سے لڑتا رہا، خاکہ نہیں لکھا۔ اچھا۔۔۔ میری عادت عجیب ہے۔ میں جب کوئی چیز لکھنے کے بارے میں سوچتا ہوں تو پہلے بہت دنوں تک غور کرتا ہوں اور پھر ٹکڑوں میں جوڑتا ہوں، اس میں چھ مہینے لگیں، برس لگیں، جب وہ تصویر مکمل ہو جاتی ہے پھر میں پاگلوں کی طرح اس کو لکھتا ہوں۔ تو جنوری کے شروع میں مجھے یہ خیال آیا کہ اب NoworNever کا مرحلہ آ گیا ہے۔ تو میں بیٹھ گیا اور لکھتا گیا، لکھتا گیا، لکھتا گیا اور انور کا خاکہ لکھ دیا۔ اس کے بعد کراچی یونی ورسٹی میں ایک میرے بڑے کرم فرماتھے اختر حسین صاحب۔ وائس چانسلر کے سیکریٹری تھے۔ انھوں نے سات وائس چانسلرز کا زمانہ دیکھا تھا، ان کا خاکہ لکھنا شروع کیا اور لکھتا گیا لکھتا گیا اور آخر لکھ دیا۔ اس کے بعد خبر آئی کہ لطیف الزماں کا انتقال ہو گیا۔ دل پہ بڑی چوٹ پڑی، بس بیٹھ گیا قلم لے کر اور ان کا خاکہ لکھتا گیا، لکھتا گیا، لکھ ڈالا۔ جہاں تک آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو آج کل بھی بہت سے لوگ اچھے خاکے لکھ رہے ہیں۔ نام لینے میں یہ خدشہ رہتا ہے کہ کسی کا نام رہ گیا تو وہ ناراض ہو گا۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھا ہے۔ سبحان اللہ! کیا خاکہ لکھا ہے۔ واہ۔۔۔ مولوی عبد الحق نے بھی خاکے لکھے، کیا خاکے لکھے ہیں اور صاحب شاہد احمد دہلوی نے کیا عمدہ خاکے لکھے ہیں۔ تو اب خاکہ نگاری ادب کا سنگھار بن گئی ہے۔ آج کل بھی خاکوں کے بہت سے اچھے مجموعے آ رہے ہیں۔

حمیرا: لیکن اب خاکوں میں ممدوح کا مذاق بھی اُڑایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فرخی: خاکہ محبت سے لکھا جاتا ہے مذاق نہیں اُڑایا جاتا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جتنے

خاکے لکھے ہیں، آپ پڑھیے۔۔۔ ان میں کیسی محبت ہے، کیسا خلوص ہے۔ مولانا محمد علی کا خاکہ دیکھیے، اصغر گونڈوی کا خاکہ دیکھیے۔ منٹو کے خاکے ''گنجے فرشتے'' نہایت اعلیٰ ہیں۔

حمیرا: بعض لوگ ناراض ہو جاتے ہیں اگر ان کے بارے میں خاکہ لکھا جائے تو۔

ڈاکٹر فرخی: کون؟

حمیرا: آپ کو تو پتا ہی ہے فہیم انصاری صاحب کے رسالے ''اجمال'' کے پہلے ہی شمارے میں ممتاز رفیق کا ایک خاکہ ''ربڑ کا مگرمچھ'' احفاظ الرحمن کے بارے میں شائع ہوا تھا جس پر انھوں نے مقدمہ بھی کر دیا جو یہ لوگ آج تک بھگت رہے ہیں۔

ڈاکٹر فرخی: دیکھیے، وہ کیس عدالت میں ہے اس لیے کچھ کہنا نہیں چاہیے لیکن بات یہ ہے کہ اگر غلط بیانی کی گئی ہے تو اس پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ شخصیت کی کوتاہ نظری بیان کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ خاکہ لکھنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کو کون سا چھوڑ دیا ہے؟ ''تہمد باندھے ہوئے، توند پر لپیٹے، ننگے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ خدا معلوم کیسی کڑوی تمباکو پیتے ہیں کہ دماغ سڑ جاتا ہے۔'' بات یہ ہے کہ ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔ یہ وصف صرف پیغمبروں اور اولیا میں ہے کہ وہ خامیوں سے پاک ہیں ورنہ کوئی بھی عام انسان خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ اچھا انسان وہ ہے جس میں خوبیاں زیادہ ہوں۔ جس میں خامیاں زیادہ ہو وہ اچھا انسان نہیں ہو سکتا۔

حمیرا: آپ نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور کہا جاتا ہے کہ آپ فی البدیہہ شعر گوئی میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں پھر اس کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیا۔ شاعری کا کوئی مجموعہ کیوں شائع نہیں کرایا؟

ڈاکٹر فرخی: ہاں شاعری سے آغاز کیا۔ پھر افسانے لکھے۔ آپ کو میرا ہاتھ طولانی تو نظر نہیں آیا ہوگا تو یدِ طولیٰ رکھنے کی بات تو غلط ہے۔ ہاں یہ سوال آپ کا بہت اچھا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس شخص نے بچپن سے شعر و شاعری کے ماحول میں پرورش پائی ہو تو اس کی فطرت میں برجستہ گوئی آ ہی جاتی ہے۔ آج بھی ہمارے گھر میں گفتگو میں روزمرہ میں مصرعے بولے جاتے ہیں۔ ''ذرا کٹورے میں پانی پلانا'' اسی لیے عربوں نے شعر گوئی پر پابندی لگائی کہ شعر کہا جائے مقفّٰی، بالارادہ

یعنی سوچ سمجھ کر کہا جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کا کرم ہے، اس نے مجھے ایسی صلاحیت دی کہ لوگ باتیں کرتے ہیں اور میں نظم میں باتیں کر سکتا ہوں۔ ویسے مجھ سے زیادہ برجستہ گو تو اس شہر میں رئیس امروہوی تھے، راغب مراد آبادی تھے۔ وہ تو رباعیوں میں بات کرتے تھے۔ لوگ انھیں پسند کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ راغب صاحب ایک مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ وہ ہر شاعر کا نام پکارنے کے لیے ایک رباعی فی البدیہہ کہہ رہے تھے۔ میں ان کے برابر بیٹھا تھا۔ جب ان کی باری آئی تو بولے اسلم صاحب! آپ میرا نام پکار دیں۔ میں نے بھی پہلے ان کے لیے ایک رباعی فی البدیہہ کہی پھر نام پکار دیا۔ راغب صاحب بولے، بھئی آپ نے تو آج مجھے بھی مات کر دیا۔ ایسی برجستہ رباعی؟ میں نے کہا، بس آپ کی صحبت کا اثر تھا کہ ہو گئی۔ مگر راغب صاحب غضب کے شاعر تھے۔ غزل، رباعی جو کہیے وہ فوراً فی البدیہہ حاضر کر دیتے تھے۔

میری فی البدیہہ گوئی کا تذکرہ آ ہی گیا ہے تو ایک واقعہ سنیے۔ محب عارفی بزرگ شاعر اور کرم فرما تھے۔ دستگیر فیڈرل بی ایریا میں رہتے تھے۔ اُن کے یہاں ہر ہفتے کی شام کو ایک ادبی نشست ہوتی تھی۔ شاعر ادیب جمع ہوتے تھے۔ ادبی گفتگو ہوتی تھی، شعر پڑھے جاتے تھے۔ میں وہاں پابندی سے جاتا تھا۔ ایک دن کسی صاحب نے امانت لکھنوی کا یہ مطلع:

زلف کی بندش نہیں ہے سر مروڑا سانپ کا
کیا ہی کنڈلی مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

پڑھا اور کہا، ''اب ایسا مطلع کہنا ممکن نہیں۔'' آپ کے والد اطہر نادرؔ مرحوم نے میری طرف دیکھا اور کہا، ''ڈاکٹر صاحب! کیا کہتے ہیں؟'' میں نے کہا، ''غزل کہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میز پر سے کاغذ اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد میں نے محب صاحب اور اطہر نادرؔ کی طرف دیکھا اور کہا، غزل سنیے۔ پوری غزل تو یاد نہیں چند شعر یاد ہیں:

کون کہتا ہے ہوا دنیا میں توڑا سانپ کا
آستیں جھٹکو، نکل آئے گا جوڑا سانپ کا
بس بھرے ثابت ہوئے سارے کرم فرما مرے

نیشِ عقرب تھا زیادہ زہر تھوڑا سانپ کا
کھیلتے رہتے تھے ہم بھی زلف پیچاں سے کبھی
پیار میں ہم نے بھی اکثر سر مروڑا سانپ کا
کس مزے سے کھیلتا ہے میرا طفل نے سوار
گاہے گھوڑا سانپ کا ہے، گاہے کوڑا سانپ کا
اطہر نادر نے لکھوائی یہ زہریلی غزل
زہر ورنہ میں نے اسلمؔ کب نچوڑا سانپ کا

محب صاحب اور اطہر نادرؔ غزل سن کر حیران رہ گئے۔

اسی طرح ایک اور دلچسپ واقعہ سنیئے۔ کراچی یونی ورسٹی کے پروفیسروں کے لیے انٹرویو ہو رہا تھا اس میں شعبۂ اردو کے پروفیسر بھی شامل تھے۔ تین آسامیاں تھیں اور تین ہی اساتذہ امیدوار تھے۔ فرمان فتح پوری، ابوالخیر کشفی اور میں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ یہ انٹرویو محض ضابطے کی کاروائی تھی۔ پروفیسر احسان رشید، ڈاکٹر شامی، ہائی کورٹ کے ایک جج اور مظفر حسین، ڈین کلیۂ فنون، انٹرویو لے رہے تھے۔ اپنی باری پر میں اندر گیا۔ سلام دعا کے بعد پروفیسر احسان رشید نے کہا، ڈاکٹر صاحب! آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ فی البدیہہ شعر کہتے ہیں اور بہت اچھا کہتے ہیں تو آج کیا اس موقع کی مناسبت سے کوئی شعر سنایئے ان کا یہ کہنا مجھے بہت ناگوار گزرا کیوں کہ میں شاعر کی حیثیت سے انٹرویو دینے نہیں گیا تھا۔ مجھ سے تو یہ سوال کیا جاتا کہ صاحب! آپ اردو میں کیا پڑھاتے ہیں، کون سا موضوع آپ کا خاص ہے؟ بہر حال ان کی بات پر مظفر حسین نے کہا کہ سنا کیا ہے، کہتے ہیں اور بہت اچھا کہتے ہیں۔ بھائی! شعر پڑھو۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ اس وقت کیا ہوا۔ خار تھا کہ خداوند تعالیٰ کا کرم۔ میں نے کہا، کوئی گستاخی منظور نہیں ہے۔ آپ نے حکم فرمایا ہے تو عرض کرتا ہوں اور شعر پڑھ دیا۔

نہ کرو خیالِ وی سی، نہ فریبِ ڈین کھاؤ
وتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَن تَشَاءُ

بس صاحب۔۔۔ پھر کیا تھا۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ پروفیسر احسان رشید کا چہرہ سفید ہو گیا۔

جج صاحب نے کہا، ڈاکٹر صاحب ! انٹرویو مکمل ہو گیا، السلام علیکم۔ بعد میں مجھے اطلاع ملی کہ جج صاحب نے کہا کہ اس شخص نے تو کمال کر دیا۔ ہم نے تو کتابوں میں پڑھا تھا کہ بادشاہوں کے دربار میں ایسے شاعر ہوتے تھے جو موقع کی مناسبت سے فی البدیہہ شاعری کرتے تھے۔ اس نے ہمارے سامنے شعر پڑھ دیا۔ پھر مظفر حسین نے باہر نکل کر سب کو سنایا تو ایک دم یہ شعر مشہور ہو گیا اور لوگ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے، وتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ۔ مجھے آج تک حیرت ہے کہ یہ سرزد کیسے ہو گیا؟ اچھا اب اس کا تتمہ بھی سنیے۔ کافی عرصہ بعد ایک مرتبہ پھر اردو کے لیے استادوں کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ ظفر سعید سیفی وائس چانسلر تھے، ایکسپرٹ کی حیثیت سے ہم بھی موجود تھے۔ ایک امیدوار آئے، میں نے ان سے کوئی سوال پوچھا، انھوں نے جواب دیا تو سیفی کہنے لگے، یہ جو آج آپ سے سوال پوچھ رہے ہیں تو ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ یہ آپ کی جگہ بیٹھے تھے اور ان سے سوال ہوا تھا کہ آپ برجستہ شعر کہتے ہیں تو کوئی شعر سنایئے۔ اس پر انھوں نے یہ شعر سنایا تھا:

نہ کرو خیالِ وی سی، نہ فریبِ ڈین کھاؤ
وتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَن تَشَاءُ

تو سیفی کو اس وقت تک یہ شعر یاد تھا۔

حمیرا: مگر میں یہ بات جاننا چاہ رہی تھی کہ آپ نے شاعری کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیا اور کوئی مجموعہ کیوں نہیں آیا؟

ڈاکٹر فرخی: شاعری میری شناخت نہیں بن سکی۔ بس جب ریڈیو میں آ گیا تو شعر و شاعری کا سلسلہ کم ہو گیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ کم ہونے کے باوجود شعر اپنے آپ کو کہلوا ہی لیتا ہے۔ شعر آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں اب بھی جب سوچتا ہوں تو غزل پہ غزل، غزل پہ غزل لکھتا رہتا ہوں۔ کچھ حافظے میں محفوظ رہ جاتی ہیں کچھ نہیں۔ ایک غزل آج ہی صبح یاد آئی۔ خدا معلوم کسی زمانے کی ہے، سنیے:

کبھی ہے قہر کبھی ہیں شرار آنکھوں میں
ترے نثار کبھی کچھ تو پیار آنکھوں میں

گزرتے لمحوں کے منظر نظر میں ہیں محفوظ
سجائے بیٹھا ہوں کتنے مزار آنکھوں میں
گلاب دیکھنے نکلے تھے شہر میں ہم بھی
اُتر گئی ہے مگر نوکِ خار آنکھوں میں
ہوا نے خاک کا طوفاں اُڑا دیا کب کا
جما ہوا ہے ابھی تک غبار آنکھوں میں
قبائے ناز میں سو رنگ بے حجابی کے
برس رہی ہے حیا کی پھوار آنکھوں میں
کچھ اور بن نہ پڑا جب وہ آگیا اسلمؔ
بٹھا لیا اُسے بے اختیار آنکھوں میں

جہاں تک مجموعہ کلام شائع کرنے کا تعلق ہے تو ہمارے خاندان پر کچھ یہ اثر ہے کہ دادا نے اپنا مجموعہ شائع نہیں کرایا۔ والد نے مجموعہ مرتب کیا۔ بڑا خوب صورت، لال سنہرے رنگوں میں ڈیزائن کیا مگر شائع نہیں ہوا۔ میرا چھوٹا بھائی انور، میں کہتے کہتے تھک گیا اس سے۔ وہ بچوں کا بہت بڑا شاعر تھا اور ہمارے عہد کا بھی بہت اچھا شاعر تھا۔ میں اس سے کہتا کہ بھئی کوئی روپے پیسے کا مسئلہ ہے تو تم اپنا کلام مرتب کر کے دے دو، میں چھپواؤں گا۔ وہ کہتا ہاں! ترتیب کا کام آدھا ہو گیا ہے۔ آخر وقت تک یہی کہتا رہا اور وہ مجموعہ مرتب نہیں ہوا۔ میرا ابھی یہی حال ہے۔ کاغذ پر غزلیں لکھ لکھ کر اِدھر اُدھر رکھتا رہا۔ بیش تر کا تو پتا بھی نہیں ہے۔

حمیرا: آپ کی نگرانی میں اب تک کتنے لوگوں نے ایم فل یا پی ایچ ڈی کا تحقیقی کام مکمل کیا ہے۔ کوئی نمایاں تحقیق؟

ڈاکٹر فرخی: تعداد بتانا تو مشکل ہے لیکن بہت سے لوگوں نے کیا۔ چند نام لے دیتا ہوں۔ علّامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کی محسنہ نقوی ہیں، کراچی سے فاطمہ حسن، معراج محمد خان، ڈاکٹر مسرور احمد، محمد اقبال اسدی، ایک خلیل صاحب تھے جو انتقال کر گئے، ان کے علاوہ آج کل ایک خاتون نرگس جمشید، ادا جعفری پر تحقیق کر رہی ہیں۔ تو خاصے لوگ ہیں۔

حمیرا: اپنی دیگر تصانیف کے حوالے سے کچھ بتائیے؟

ڈاکٹر فرخی: کچھ چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں جیسے۔۔۔ فرمایا خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے، فرمایا حضرت سلطان جیؒ نے، فرمایا خواجہ غریب نوازؒ نے وغیرہ۔ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ شروع میں شخصیت کے بارے میں ایک مختصر احوال نامہ اور اس کے بعد ہر صفحے پر ان کا ایک قول درج ہے۔ یہ کتابیں بڑی مقبول ہوئیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ والی کتاب کے نجانے کتنے ایڈیشن اردو میں شائع ہوئے، ہندی اور انگریزی میں چھپے اور خواجہ غریب نواز والی کتاب کا تو یہ احوال ہے کہ وہ ہندوستان سے ایک صاحب نے میری اجازت سے شائع کرا کے تقسیم کی۔ پھر اس کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔ یہاں کراچی میں ایک صاحب ہیں جو ہر سال اسے پابندی سے رجب کے مہینے میں شائع کرا کے تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بچوں کے لیے ادب کے مشاہیر کے بارے میں مختصر کتابیں لکھیں جیسے۔۔ بچوں کے مرزا غالبؔ، بچوں کے شبلی نعمانی، بچوں کے نذیر احمد، بچوں کے مولوی عبدالحق وغیرہ۔

حمیرا: ادب میں نقاد کا مقام کیا ہے اور اس کا وجود کتنا ضروری ہے؟

ڈاکٹر فرخی: نقاد کا مقام بہت بڑا ہے اور اس کا وجود بھی بہت ضروری ہے۔ کسی بھی فن پارے کی قدر و قیمت کے تعین میں نقاد کا کردار بڑا اہم ہے۔

حمیرا: ایک خیال یہ ہے کہ ادب میں غیر جانب دارانہ تنقید کا چلن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں؟

ڈاکٹر فرخی: یہ تو ہر زمانے میں رہا ہے بھائی! ایک شاعر ہمارے دوست ہیں تو بڑے شاعر ہیں، دوست نہیں ہیں تو معمولی شاعر ہیں مگر تنقید بھی وہی زندہ رہتی ہے جس میں فطری عظمت ہو جس میں فن کو پرکھنے اور سمجھانے پر عبور ہو۔ جو بذات خود ادب کا شہ کار بن جائے۔ میں مثال دیتا ہوں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی۔ انھوں نے دیوانِ غالبؔ، نسخۂ حمیدیہ کا دیباچہ لکھا۔ بعد میں یہ دیباچہ ''محاسنِ کلام غالبؔ'' کے عنوان سے شائع ہوا اور اردو تنقید کا منارۂ نور بن گیا۔ یہ اعلیٰ درجے کی تنقید کا شہ پارہ ہے۔ اس جیسی تنقید بہت کم لکھی گئی۔

حمیرا: آج کی موجودہ ادبی فضا کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کچھ لوگ ادبی انحطاط کی باتیں

بھی کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر فرخی: بات یہ ہے کہ اپنی خرابیِ صحت کی وجہ سے میرا پڑھنا لکھنا برائے نام رہ گیا ہے۔ کئی برس ہوئے میں آج کل کے ادب کو صحیح طور پر پڑھ نہیں پاتا۔ تو اس بارے میں میری رائے قابلِ اعتبار نہیں ہو گی۔

حمیرا: آپ تو اپنی عمر اور بیماری کی وجہ سے مجبور ہیں، نہیں پڑھ پاتے لیکن اب تو ہمارے اکثر ادیبوں اور شعرا میں بھی مطالعے کا فقدان ہے۔

ڈاکٹر فرخی: میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کیوں کہ "بدقسمتی" سے میں بنیادی طور پر استاد ہوں لہٰذا جو بھی نوجوان یہاں آتا ہے، بیٹھتا ہے، بات کرتا ہے، اگر اس کا تلفظ بھی غلط ہو تو میں ٹوک دیتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔

حمیرا: اردو ادب کا بین الاقوامی ادب میں کیا مقام ہے؟

ڈاکٹر فرخی: ہر ادب کا ایک مقام ہوتا ہے۔ اردو ادب کا بھی یقیناً ہے۔ میں پچھلے سال انگریزی کی ایک شاعرہ کا مجموعہ پڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دیباچے میں یہ حوالہ دیا تھا کہ برصغیر کے ایک اردو شاعر نے، غالبؔ اس کا نام تھا، موت کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ بے مثال شاعر تھا۔ تو غالبؔ کی شہرت بین الاقوامی ہوئی نا؟

حمیرا: ادبی گروہ بندیاں پہلے بھی رہی ہیں لیکن اب کچھ زیادہ ہی دیکھنے میں آرہی ہیں۔ ابلاغ کی راہ میں دیواریں کھڑی کی جارہی ہیں۔ ہم برصغیر کی تقسیم سے پہلے بلکہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے کا ادبی اور تہذیبی ماحول اور فضا دیکھتے ہیں تو اس وقت ذرائع ابلاغ آج کی نسبت تیز رفتار بھی نہ تھے پھر بھی کسی ادبی مرکز مثلاً لکھنؤ، دلّی یا لاہور کے کسی جریدے میں کسی شاعر کا کلام یا ادیب کا افسانہ شائع ہوتا تھا تو دنوں میں اس کی شہرت برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی تھی۔ رسل و رسائل کا نظام سست ہونے کے باوجود بہت مستحکم تھا۔ گروہ بندیوں کے باوجود رواداری کا چلن تھا۔ یہ رواداری اب دکھائی نہیں دیتی۔ برصغیر کی تقسیم، بھارت اور پاکستان کے درمیان سرحدی "دیواریں" وجود میں آنے اور آمد و رفت میں قدغنوں کے باوجود دلّی کے ماہ نامہ "بیسویں صدی" میں دونوں ملکوں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ آج

احوال واقعی میں پیش رفت کی بجائے پس رفت نظر آتی ہے۔ پرنٹ کے ساتھ ساتھ الیکٹرونک میڈیا کے لوگوں کا مبلغ علم بھی بڑا ہی سطحی سا ملتا ہے۔ لاہور میں کوئی نام نہاد عالمی ادبی اجتماع یا کانفرنس ہوتی ہے تو کراچی کے قارئین یا ادیبوں شاعروں کو چند بے ربط سطروں میں اس کا احوال پڑھنے یا سننے کو ملتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان جیسا نام نہاد بڑا سرکاری ادارہ بھی کسی ایسی ہی تقریب کا اہتمام کرتا ہے تو اسے اشتہار چھپوانا پڑتا ہے۔ پھر اس تقریب میں کیا ہوتا ہے؟ کوئی نہیں جان پاتا۔ علم و ادب کی اس صورت حال کا کوئی تدارک ہے؟

ڈاکٹر فرخی: دیکھیے بات یہ ہے کہ یہ جو آپ نے کہا کہ بڑے بڑے مرکز تھے اور وہاں سے جو چیز بھی نکلتی تھی وہ مشہور ہو جاتی تھی۔ تو زبان و ادب کے بڑے بڑے مرکز تو اب بھی ہیں اور جو ادبی چیزیں لکھی جارہی ہیں وہ مشہور بھی ہو جاتی ہیں اور سب اس کے بارے میں گفتگو بھی کرتے ہیں۔ لاہور ہو، اسلام آباد ہو، پنڈی ہو، فیصل آباد ہو، ملتان ہو، حیدرآباد ہو، کوئٹہ ہو یا کراچی ہو۔ ہر جگہ اچھی چیزیں جاتی ہیں اور وہ سارے ملک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ آج کا انسان بہت زیادہ مصروف ہو گیا ہے۔ پہلے زمانے کے انسان کے مقابلے میں۔ پہلے ہر آدمی رات کو بستر پر لیٹ کر کوئی کتاب پڑھتا تھا، کوئی افسانہ پڑھتا تھا، کوئی ناول پڑھتا تھا، شاعری پڑھتا تھا، اس پر سوچتا تھا۔ اب برقیاتی میڈیا نے اس عادت کو ختم کر دیا ہے اور یہ ہمارے ہاں ہی ہوا ہے کیوں کہ دوسرے ممالک میں پڑھنے کی عادت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کا اثر ہمارے لکھنے والوں پر بھی پڑا ہے اور پڑتا ہی چلا جارہا ہے۔ ہمارے یہاں جو ادبی مراکز ہیں، ان میں ادبی مکالمے بھی ہوتے رہتے ہیں، ادبی نشستیں بھی ہوتی رہتی ہیں، ادبی تقریبات بھی ہوتی رہتی ہیں۔ لوگ ملتے جلتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی چیزیں سناتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک بڑی بات یہ ہوئی کہ اخبارات نے ادب کو کسی حد تک دبا دیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اپنے زمانے میں روزنامہ ''امروز'' بڑے اہتمام سے ادبی صفحہ شائع کیا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے لکھنے والوں کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ آج نام نہاد ادبی صفحات پر کس پائے کا ادب شائع ہوتا ہے، یہ میرے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا۔۔۔ اور جو آپ نے سرکاری اداروں کا تذکرہ کیا تو بھائی! سرکاری ادارے تو اسی طرح کے ہوتے ہیں، ان سے کیا خدمت لی جائے؟

حمیرا: پاکستان میں مختلف حکومتوں نے اپنے اپنے ادوار میں ادب کے فروغ کے لیے جو اقدامات کیے، آپ ان سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر فرخی: دیکھیے یہ سوال سیاسی نوعیت کا ہے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ ہاں البتہ جن اداروں نے کام کیے ہیں ان میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ

اردو لغت بورڈ نے جو لغت شائع کی ہے وہ ایک اہم کارنامہ ہے؟

حمیرا: مگر اس کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ اس کو پڑھنا بھی ایک دشوار مرحلہ ہے۔

ڈاکٹر فرخی: نہیں یہ بات تو غلط ہے۔

حمیرا: اردو زبان و ادب کے فروغ اور بگاڑ میں اخبارات اور چینلز کا کیا کردار ہے؟

ڈاکٹر فرخی: میرا خیال ہے کہ یہ جھگڑا کرانے والا سوال ہے، اسے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

حمیرا: ایک رائے ہے کہ تحقیق و تنقید کے حوالے سے پاکستان کی نسبت بھارت میں زیادہ کام ہو رہا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر فرخی: دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔

حمیرا: عدم برداشت کے اس معاشرے میں ادیب و شاعری کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

ڈاکٹر فرخی: ادیب و شاعر کی ذمہ داریاں یہ ہیں کہ وہ معاشرے میں اپنی تحریروں سے حُسن اور خوبصورتی لائیں، محبت پیدا کریں اور معاشرے کی برائیوں کو ٹھیک کریں۔

حمیرا: آپ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر سب سے زیادہ کس کا اثر قبول کیا؟

ڈاکٹر فرخی: یہ بتانا بڑا مشکل ہے۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ میں نے شاعری میں غالبؔ کا بھی اثر قبول کیا، جوشؔ کا بھی اثر قبول کیا اور اپنے عہد کے بے شمار دوسرے شاعروں کا اثر قبول کیا۔ نثر میں بھی بے شمار لوگوں کا اثر قبول کیا۔

حمیرا: احتجاجی اور مزاحمتی ادب کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر فرخی: بہت اچھی رائے ہے۔ اس سے ادب کو بہت فروغ ملا اور مل رہا ہے۔

حمیرا: آپ کی وابستگی درس و تدریس سے بھی رہی ہے۔ اس حوالے سے بتایئے کہ اس وقت اردو کی تعلیمی صورت حال کیا ہے اور کتنے طلبہ اردو ادب و لسانیات میں دل چسپی رکھتے ہیں؟

ڈاکٹر فرخی: اُس وقت بہت اچھی تھی اب بہت خراب ہے۔ یہ سوال ایک پورا مکالمہ چاہتا ہے۔ مختصراً یہ کہ اُس زمانے میں بھی طالب علموں میں یہ جذبہ پیدا ہو چلا تھا کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے علم حاصل کرو۔ اچھی نوکری مل جائے۔ اب یہی زندگی کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔

حمیرا: لسانیات کے سلسلے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟ لسانیات کے کچھ ماہرین کا نام لیں۔

ڈاکٹر فرخی: میرا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل سائنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماہرین لسانیات نے بہت کام کیا ہے تاہم ہمارے یہاں تو نہیں ہیں۔

حمیرا: آج کا طالب علم اردو زبان خصوصاً شعر و ادب سے دور کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ بحیثیت استاد آپ کے زمانے کا طالب علم کیسا تھا اور اپنے زمانے میں خود آپ کیسے طالب علم تھے؟

ڈاکٹر فرخی: آج کا طالب علم تعلیم ہی سے دور ہوتا جا رہا ہے تو اردو ادب کیا اور شعر کیا؟

حمیرا: فی زمانہ تعلیمی ادارے تو بہت کھل رہے ہیں، ہر سطح کے اساتذہ بھی بہت ہیں پھر بھی تعلیمی معیار روبہ تنزل ہے۔ اس کی وجہ؟ اور اس کا حل کیا ہے؟

ڈاکٹر فرخی: اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ نہ پڑھانے والے پڑھا رہے ہیں اور نہ پڑھنے والے پڑھ رہے ہیں۔ اساتذہ ایسے کام کر رہے ہیں جن میں زیادہ نفع ہو۔

حمیرا: فی زمانہ استاد اور شاگرد کے تعلقات اور رویے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر فرخی: فی زمانہ استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات میں بہت زیادہ کمی اور سرد مہری آگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلاس میں دو دو سو طالب علم بیٹھے ہوں گے تو استاد کو کیا معلوم کہ کس کی ذہنی سطح، ہماری ذہنی سطح کے ساتھ چل رہی ہے۔ ہم جو کچھ پڑھا رہے ہیں وہ اس کی سمجھ میں آرہا ہے یا نہیں؟

حمیرا: جب آپ پڑھاتے تھے تو ایک وقت میں کتنے طلباء ہوتے تھے۔

ڈاکٹر فرخی: اس وقت ایک کلاس میں سو طالب علم ہوتے تھے۔

حمیرا: اور جب آپ خود طالب علم تھے؟

ڈاکٹر فرخی: جب ہم پڑھتے تھے اُس وقت چار طالب علم ہوتے تھے۔

حمیرا: طلبہ میں امتحان میں نقل کا رجحان تو بڑھ ہی گیا ہے مگر اب تو اساتذہ بھی سرقہ کرنے

لگے ہیں۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر فرخی: یہ معاشرے میں ایک مرض ہے جسے جلد از جلد دور ہونا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ جب کسی معاشرے اور ملک میں حکومت مستحکم ہو، حالات مستحکم ہوں، عدل اور انصاف ہو تو نظامِ تعلیم بھی صحیح طریقے سے کام کرتا ہے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ ہر خطے کا نظامِ تعلیم الگ ہے۔ تو تعلیم میں ابتری نہیں پیدا ہوگی تو خوبی کہاں سے پیدا ہوگی؟

حمیرا: گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے کیا محسوس ہوتا ہے؟

ڈاکٹر فرخی: غالب کا شعر یاد آتا ہے:

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من پرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

حمیرا: آپ نے اپنی سوانح کیوں نہیں لکھی؟

ڈاکٹر فرخی: اس لیے کہ سچ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

تو بہت سے نام ایسے آئیں گے جو اگر لکھ دیے جائیں تو فہیم انصاری تو ایک مقدمہ بھگت رہے ہیں مجھے نہ جانے کتنے مقدمات بھگتنے پڑیں۔

حمیرا: بڑے اور اچھے ادب میں کیا فرق ہے؟

ڈاکٹر فرخی: بڑا ادب وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور اچھا ادب، اچھا تو ہوتا ہے لیکن وقت کی تبدیلی کا پابند نہیں ہوتا۔

حمیرا: بزرگ نسل آنے والی نسل کے لیے کیا چھوڑ کر جارہی ہے؟

ڈاکٹر فرخی: بم دھماکے چھوڑ کر جارہی ہے۔

حمیرا: یہ تو غلط بات ہے۔

ڈاکٹر فرخی: کیوں یہی تو ہو رہا ہے۔

حمیرا: نہیں۔۔۔ میں تو ادب و شعر کے حوالے سے پوچھ رہی ہوں۔

ڈاکٹر فرخی: ادب و شعر کے حوالے سے اچھا ذخیرہ چھوڑ کر جا رہی ہے۔

حمیرا: کچھ اپنی شریک حیات اور اولاد کے بارے میں بتائیے۔

ڈاکٹر فرخی: میری اہلیہ تاج بیگم ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی اور شاہد احمد دہلوی کی بھتیجی ہیں۔ ان کا بھی پورا گھرانہ ادبی ہے۔ تاج فرخی تین کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، شاہد احمد دہلوی اور خدیجہ مستور پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا تعلق درس و تدریس سے ہے اس حوالے سے ہزاروں شاگردوں کی استاد ہیں جو ان سے ملنے آتی رہتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں امریکا سے مونا شہاب آئی تھیں تو ان سے بھی ملنے آئیں اور اپنی کتابیں دے گئیں۔ میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے طارق کو پڑھنے کی حد تک ادب سے دل چسپی ہے، البتہ چھوٹے بیٹے آصف فرخی کو تو آپ جانتی ہی ہیں، وہ بھی ادیب ہیں۔

حمیرا: آصف کو آپ گھیر کے ادب کی طرف لائے یا ان کا اپنا ذہن تھا؟

ڈاکٹر فرخی: نہیں ان کا اپنا ذہن تھا۔ اچھا اب میں تھک گیا ہوں۔ اسی طرح بولتا رہوں گا تو اِن شاء اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ کی عمر بھی ناکافی ہو گی۔

حمیرا: ظاہر ہے، اس پیار بھری سرزنش کے بعد مزید گفتگو کی گنجائش نہیں تھی سو ہم نے بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن سے اجازت طلب کر لی۔

(بشکریہ کتابی سلسلہ ”اجمال“ کراچی، شمارہ ۷)

رخسانہ صبا☆

اسلم فرخی کے خاکوں میں افسانوی عناصر

قلمی خاکوں کو کرداری افسانوں کا رنگ دینے والے ڈاکٹر اسلم فرخی اب خود زندگی کی کہانی سے بظاہر کسی کردار کی طرح باہر نکل گئے ہیں لیکن اُن کے علمی، تحقیقی، تنقیدی، تدریسی اور شعری کارناموں کے ساتھ ساتھ تصوف اور خاکہ نگاری کے باب میں اُن کا ادبی سرمایہ ایسا ہے جس نے اُنھیں خود کسی بے مثال خاکے کا لازوال کردار بنا دیا ہے۔

قلمی خاکے یقیناً سوانحی، تاثراتی یا تعارفی مضمون سے الگ ہوتے ہیں کیوں کہ خاکہ نگار کا مقصد کسی شخصیت کے افکار و کردار کی مدد سے بحیثیت انسان اس کی انفرادیت کو نمایاں کرنا ہے، اُس شخصیت کے سوانحی حالات بیان کرنا نہیں۔(۱)

اسی طرح سوانح نگاری، سیرت نگاری، تذکرہ نویسی اور ادبی تاریخ نویسی کے تقابل میں خاکہ نگاری ایک علاحدہ صنفِ ادب ہے۔ اگرچہ اردو میں قلمی خاکوں کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں، کیوں کہ اہلِ نقد و نظر اس بات پر متفق ہیں کہ شخصی خاکہ نگاری کی ابتدائی جھلکیاں ہمیں ''آبِ حیات'' میں ہی نظر آتی ہیں جس میں آزادؔ نے ڈرامائی تکنیک استعمال کرتے ہوئے فقروں کے ایجاز و اختصار، اسلوب کے حسن و جمال اور الفاظ کے برمحل استعمال سے شاعر کی بولتی چالتی اور چلتی پھرتی تصویریں پیش کر دی ہیں۔(۲) مرزا فرحت اللہ بیگ نے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ اُن کی زبانی'' لکھ کر گویا اردو میں باقاعدہ خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اُن کی دوسری قابلِ ذکر کتاب ''دلّی کا یادگار مشاعرہ'' میں سماجی خصائص کو زندہ کرنے کے ساتھ ساتھ افراد پر بھی توجہ نظر آتی ہے اور اس میں ''آبِ حیات'' کی تکنیک کا پرتو بھی موجود ہے۔(۳) گیارہ مختصر خاکوں کا مجموعہ ''کیا خوب آدمی تھا'' ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر عابد حسین نے شائع کیا جس میں گیارہ ادبی شخصیات کے خاکے مختلف خاکہ نگاروں نے تحریر کیے تھے، یہ خاکے ریڈیائی ضرورت کے تحت

☆انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال، کراچی۔۷۵۳۵۰

لکھے گئے تھے۔(۴) خاکہ نگاری کی ارتقائی کڑیوں میں ایک اور مجموعے کو بھی اہم کڑی کی حیثیت حاصل ہے جو ۱۹۴۸ء میں نئے ادب کے معمار کے عنوان سے شائع ہوا جس میں ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، منٹو اور علی سردار جعفری جیسے نامور قلم کاروں کے تحریر کردہ خاکے شامل تھے۔ عصمت چغتائی کا مشہور و معروف خاکہ "دوزخی" بھی اس میں شامل تھا جسے بقول ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر بشیر سیفی نے خاکہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے وزنی دلائل دیے تھے۔(۵) اس کے بعد بشیر احمد ہاشمی کے کرداری خاکے (گفت و شنید)، رشید احمد صدیقی (گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ)، مولوی عبدالحق (چند ہم عصر)، سعادت حسن منٹو (گنجے فرشتے، لاؤ اسپیکر)، ڈاکٹر اعجاز حسین (مُلکِ ادب کے شاہ زادے)، عبدالمجید سالک (یارانِ کہن)، اشرف صبوحی (دلّی کی چند عجیب ہستیاں)، چراغ حسن حسرت (مردمِ دیدہ)، شاہد احمد دہلوی (گنجینۂ گوہر، بزمِ خوش نفساں)، ضیاء الدین برنی (عظمتِ رفتہ) اور علی جواد زیدی (آپ سے ملیے)، شوکت تھانوی (شیش محل)، ممتاز مفتی (پیاز کے چھلکے، اور اوکھے لوگ) نے اردو خاکہ نگاری کے باب میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ ان کے علاوہ جوش ملیح آبادی، خواجہ احمد عباس، مالک رام، گلزار وفا چودھری، حمید اختر، ابوالفضل صدیقی، احمد بشیر اور شجاع احمد زیبا نے بھی قلمی خاکے تحریر کیے۔ عہدِ حاضر تک پہنچتے پہنچتے خاکوں کے اور بھی کئی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور اب خاکہ نگاری نے ایک باقاعدہ صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اردو خاکہ نگاری کے اس سفر میں ڈاکٹر اسلم فرخی کا نام نہ صرف یہ کہ بے حد اہم ہے بلکہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "ان خاکوں میں ان کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور یہ خاکے تاریخِ خاکہ نگاری میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔(٦) پروفیسر سحر انصاری کا خیال بھی یہی ہے کہ خاکہ نگاری کے ضمن میں متعدد اہلِ قلم نام کما چکے ہیں، اس لیے اس کوچے میں اپنی راہ نکالنا خاصا مشکل کام تھا لیکن اپنی ذہانت اور علمی پس منظر سے کام لے کر ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس میدان میں اپنی انفرادیت کا سکّہ جمایا۔(۷)

خاکہ نگاری میں ڈاکٹر اسلم فرخی کا جو کام ہے، اُسے ہمیں دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا:

(الف) اُن روحانی اور کلاسیکی شخصیات کے خاکے جن سے زمانی بُعد کی وجہ سے ڈاکٹر اسلم فرخی کی براہِ راست ملاقات نہیں ہو سکی اور جنھیں ادبی خاکوں کا نام دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی

نے اُن شخصیات سے عقیدت و موّدت، قلبی وابستگی اور والہانہ شیفتگی کی بنیاد پر یہ خاکے تحریر کیے ہیں، مثلاً داتا گنج بخش، غوث الاعظم عبد القادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، امیر خسرو، محمد حسین آزاد اور اردو کے کلاسیکی شعرا کے خاکے۔

بچوں کے لیے ہمدرد فاؤنڈیشن کے تحت ''ہمارے نامور ادیب و شاعر'' کے عنوان سے مشاہیر شعرا و اُدبا کا تعارفی سلسلہ شروع کیا جن میں 'سلطان جی'، 'امیر خسرو'، 'غالب'، 'ڈپٹی نذیر احمد'، 'شبلی نعمانی'، حسرت موہانی، محمد حسین آزاد، ڈاکٹر غلام مصطفی خان شامل ہیں۔ ان کتابوں میں سادہ اور پُر کار اسلوب میں شخصیت نگاری کا فن کمالِ ہنر مندی کے ساتھ موجود ہے۔

''سات آسمان'' شہر زاد، کراچی سے ۲۰۱۱ء شائع ہوئی جس میں اردو زبان کے سات کلاسیکی شاعروں کے ادبی خاکے موجود ہیں۔ ان میں میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ اور محمد ابراہیم ذوقؔ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد کا خاکہ بھی خاصے کی چیز ہے جو ''نگارستانِ آزادؔ'' میں شامل ہے۔(۸)

قلمی خاکے وہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جن میں اُن شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہو جن کا خاکہ نگار سے گہرا ربط و تعلق ہو، اسی لیے قلمی خاکوں میں کسی شخصیت کے ذاتی خصائل و حالات، خلوت و جلوت کے معاملات، سفر و حضر کی کیفیات، ذاتی پسند ناپسند، غیر شعوری حرکات، علم و عمل کے مرحلے اور صحبتوں اور رفاقتوں کے سلسلے بیان کیے جاتے ہیں۔ اچھا خاکہ نگار جس شخصیت کا انتخاب کرتا ہے، غیر جانب دار ہو کر اس کی اصل تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہے، گویا قلمی خاکہ انسان کا سچا اور بے لاگ عکس ہوتا ہے۔(۹) ڈاکٹر اسلم فرخی کے ادبی خاکوں کی بنیاد بہر حال عقیدت و محبت پر رکھی گئی ہے مثلاً ''نظام رنگ'' کا یہ ابتدائی جملہ دیکھیے:

> ''دل نے کہا، سب کے خاکے لکھتے ہو۔ اس کا خاکہ کیوں نہیں لکھتے جو تمھاری فکر و نظر کا محور ہے۔''۰(۱۰)

اسی طرح آزادؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> جس سال مخالفوں نے مولوی محمد باقر کی زندگی کا چراغ گُل کرنے کی کوشش کی

تھی، اُسی سال قدرت نے اُن کے کاشانے میں ایک ایسی شمع روشن کر دی جس کی روشی لازوال ثابت ہوئی، دور دور تک پہنچی اور دلوں کو منور کر گئی۔(۱۱)

گویا ڈاکٹر صاحب نے خاکے لکھتے ہوئے اس شرط کو بر قرار رکھا ہے کہ خاکہ نگار کا شخصیت سے ربط و تعلق ضروری ہے۔ اب یہ ربط و تعلق جسمانی ہو یا روحانی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی تصوف کی راہ کے بھی مسافر رہے ہیں، اس لیے ان خاکوں میں وہ جسم و روح کی دوئی کو بر قرار رکھنے کے بجائے، انھیں ہم آہنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "سات آسمان" سے دو مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

"وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں ہے۔" یہ ہے کہ میر صاحب سے مل کر، انھیں سن کر اور انھیں پڑھ کر ایک طرح کا تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔(۱۲)

پانی میں ایک پتھر اچانک آ گرا تھا۔ سطح پر لہریں نمودار ہوئی تھیں، لمحے بھر کے بعد پھر وہی سناٹا اور سکون۔ دونوں بزرگ دنیا و مافیہا سے بے نیاز، طمانیت کا سمندر بنے بیٹھے تھے۔(۱۳)

(ب) دوسری قسم کے خاکے اُن شخصیات کے قلمی خاکے ہیں جن سے ادبی، سماجی یا علمی سطح پر کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر اسلم فرخی کی ملاقاتیں رہیں یا ذاتی اور خاندانی مراسم کے حوالے سے ان شخصیات سے کچھ یادیں وابستہ رہیں۔ ان خاکوں کا سب سے نمایاں پہلو ان کا افسانوی اسلوب ہے بلکہ کہیں کہیں تو یہ داستانوی اسلوب میں ڈھل گیا ہے، مثلاً:

"جب سارے درویش اپنی اپنی کہہ کر رخصت ہو گئے اور محفل پر سناٹا چھا گیا تو ایک درویش جو باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا، اہلِ محفل کے سامنے آیا اور بولا اب اس آخری درویش کی کہانی بھی سن لیں — کانوں سنی بھی ہے اور آنکھوں دیکھی بھی۔(۱۴)

اس قسم کے خاکوں کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) "گل دستۂ احباب"، مکتبۂ دانیال، کراچی، اگست ۱۹۹۴ء

یہ ڈاکٹر صاحب کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں سترہ نامور ادبی شخصیات کے خاکے ہیں جن میں ڈاکٹر غلام مصطفی خاں، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، تابش دہلوی، شان الحق حقی، ذوالفقار علی بخاری، ارشد تھانوی، سلیم احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجتبیٰ حسین، عزیز حامد مدنی، انجم اعظمی، کرار نوری، ڈاکٹر مشیر الحق، مسرت علی سرور، غلام ربانی تاباں اور ضمیر الدین احمد شامل ہیں۔

(۲) ''آنگن میں ستارے''، شہر زاد، کراچی، جنوری ۲۰۰۱ء

یہ مجموعہ دو حصوں میں منقسم ہے، اس میں بھی ''گل دستۂ احباب'' کی طرح سترہ ہی خاکے ہیں۔ پہلے حصے میں پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر، مالک رام، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر یاور عباس، نور الحسن جعفری، انور عنایت اللہ، ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی، مولوی ثناء الحق صدیقی، حمید نسیم، حکیم چٹکلے باز، پتلے اکرام کے خاکے شامل ہیں اور دوسرے حصے میں شریف کنجاہی، ادا جعفری، پیرزادہ قاسم، واصل عثمانی، محمد احمد سبزواری اور ضمیر نیازی جیسے نامور تخلیق کاروں کے خاکے ہیں۔

(۳) ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، شہر زاد، کراچی، ۲۰۰۵ء

اس مجموعے میں کل نو خاکے ہیں جن میں سے پانچ شخصیات کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے کہ ''وہ میرے شہر فتح گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔''۰(۱۵) اس کتاب میں وفآ فرخ آبادی، شوکت بھائی، مرزا نعیم اللہ رسواؔ الیاس احمد مجیبی، باجی آپا، شمس زبیری، ظہیر احمد صدیقی، صاحب زادہ سیّد محمد علیم چشتی اور محب عارفی کے خاکے ہیں۔

(۴) ''موسمِ بہار جیسے لوگ''، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۰ء

اس مجموعے میں چودہ خاکے موجود ہیں جن میں نذرِ اشرف، شیخ ہاشم رضا، مولانا رازق الخیری، بڑے بھائی منذر احمد، شاہد احمد دہلوی، آغا اشرف، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر عبد العلیم نامی، ڈاکٹر فہیم اعظمی، مشفق خواجہ، احمد فراز، قمر جمیل، شیخ لطیف اللہ، مشتاق احمد یوسفی اور ڈاکٹر

عبد السلام جیسی قدر آور شخصیات کی یادوں کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔

(۵)"رونقِ بزمِ جہاں"، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۴ء

ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ دس خاکوں پر مشتمل یہ آخری مجموعہ ہے جن میں مولوی سیّد محمد شفیع، انور احسن صدیقی، اختر صاحب، لطیف الزماں، یعقوب لطیف، سیّد حسن فیروز، شبیر علی کاظمی، مہادیو، معین الدین حزیںؔ کاشمیری اور محمد حسین آزادؔ کی شخصیات کے خاکے موجود ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے زیادہ تر خاکے اپنے آپ کو خود پڑھواتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ان خاکوں میں افسانوی ادب کی سی چاشنی موجود ہے جو قاری کی دل چسپی کو برقرار رکھتی ہے۔ افسانے میں ابتدا، ارتقا، تجسّس اور اختتام کے مراحل جس قدر فن کارانہ ہنر مندی کے ساتھ آتے ہیں، اُسی قدر افسانہ کامیاب ہوتا ہے۔ خاص طور پر ابتدائیے کی اہمیت افسانے میں اس لیے زیادہ ہے کہ جس قدر ابتدائیہ دل چسپ، اثر انگیز یا چونکانے والا ہوگا، اُسی قدر افسانہ قاری کو اپنی سمت کھینچے گا۔ یہ خوبی ڈاکٹر اسلم فرخی کے کئی خاکوں میں بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً دیکھیے اُن کے تحریر کردہ چند خاکوں کے ابتدائی جملے:

« "لائٹ ہاؤس کی سڑک پر دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ہوگئی، دونوں کی منزل ایک تھی۔"۰(۱٦)

« "صاحبو! میں اس سفید بالوں والے خمیدہ کمر بوڑھے کو بالکل نہیں جانتا، بالکل نہیں جانتا، پہچانتا بھی نہیں، میں اُس جوانِ رعنا کو جانتا پہچانتا ہوں جو کشیدہ قامت تھا، سرخ و سفید تھا، جانِ احباب تھا۔"۰(۱۷)

« "آج کراچی جیسے بھرے پُرے آدمیوں کے جنگل میں لال سبز کبوتروں کی آخری چھتری بھی گر گئی۔ گر کیا گئی، کبوتر باز نے بے بس ہو کر خود ہی کنارہ کشی اختیار کرلی، ٹھاٹھر بہت دن سے کم زور ہوگیا تھا، جال بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔"۰(۱۸)

« ”کلاس روم بہت چھوٹا تھا اور کسی قدر تاریک، سخت حبس، گھٹا گھٹا ماحول، گرمی بہت شدید تھی، کمرے میں کہیں سے ہوا کا گزر نہیں، بجلی ضرور تھی مگر پنکھا نہیں تھا۔“ ٭(۱۹)

« ”نہ کفن خوں چکاں تھا، نہ کروڑوں بناؤ تھے، مسہری پر چٹائی بچھی تھی جس پر ایک پوپلے منھ والا مردِ ضعیف و نحیف، سفید چادروں میں لپٹا ابدی نیند سو رہا تھا، چہرے پر معصومیت اور تحیر کی ہلکی سی چھوٹ۔“ ٭(۲۰)

صرف ان چند مثالوں پر ہی غور کیجیے، ان جملوں کو پڑھ کر کس کا دل نہیں چاہے گا کہ ان تحریروں کو آخر تک پڑھے جن میں کسی دل چسپ کہانی کا سا تحیر ہے۔ تحیر افسانے کی ایک اہم صفت ہے۔ افسانہ جیسے جیسے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے، ویسے ویسے قاری ایک عالمِ حیرت کی طرف بڑھتا جاتا ہے اور اُس کے تجسّس میں اضافہ ہوتا ہے۔ یوں تو ڈاکٹر اسلم فرخی کے کئی خاکوں میں کم یا زیادہ یہ کیفیت ملتی ہے لیکن خاص طور پر تین خاکے ”جانِ بے تاب“ (باجی جمیلہ)، ٭(۲۱) ”لذت آشنائے تلخیِ دوراں“ (شوکت بھائی) ٭(۲۲) اور ”محمد حسین آزادؔ: خواندہ، شنیدہ اور فہمیدہ“ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان تینوں خاکوں میں واقعات کے ارتقا کے ساتھ ساتھ کرداری ارتقا بھی بہت نمایاں ہے۔ ”جانِ بے تاب“ اس کیفیت کا سب سے نمائندہ خاکہ ہے۔ ننھی منی جمیلہ کی گم شدگی سے لے کر اُن کے خاندانی پس منظر، پرورش و پرداخت، شادی اور پاکستان آمد سے لے کر وفات تک کے واقعات کے ساتھ ساتھ ”باجی آپا“ کا کردار جن ارتقائی مراحل سے گزرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس کردار کو نہ صرف اردو خاکہ نگاری کا ایک لاثانی کردار بنا دیا ہے بلکہ اس خاکے کو کرداری افسانے کے درجے تک بھی پہنچا دیا ہے جس میں کردار واقعات پر غالب ہے۔ بات بات پر دہل جانے اور سہم جانے والی، کونوں کھدروں میں چھپنے والی، سسرال میں چپ سادھنے والی، اپنی تنہائی اور اکیلے پن سے ڈرنے والی اور سوتن کے آنے کے بعد ہارے ہوئے سپاہی کی طرح میدانِ جنگ چھوڑنے والی باجی آپا کی شخصیت کا روز بڑھتا ہوا تیہا، بدمزاجی، بحثا بحثی، کاہلی، آدم بے زاری، چڑچڑاپن، بے حسی اور بات بات پر بگڑنا اور زمین آسمان ایک کر دینا قاری کو مسلسل تحیر اور تجسّس میں گرفتار رکھتا ہے۔

''شوکت بھائی'' کا کردار بھی دل چسپ اور بے مثال ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ''اُس مضطرب روح کو گرفت میں لانا ہمیشہ مشکل معلوم ہوا۔ اب ڈرتے ڈرتے ہمت کی ہے، نجانے اب بھی یہ مضطرب روح گرفت میں آسکی ہے یا نہیں۔'' ٭(۲۴)

بعض کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو ''لذت آشنائے تلخیِ دوراں'' ہوتے ہیں اور جنھیں ساری زندگی دوسروں کے تحقیر آمیز رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اپنی بعض صفات کی روشنی میں ایسے کردار بڑے بھی ہوتے ہیں اور خاص بھی، بس انھیں پہچاننے کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ ''شوکت بھائی'' کا کردار ایسا ہی کردار ہے جو ساری زندگی اپنوں کی بے اعتنائی اور بے حسی کا شکار رہا مگر مرتے دم تک ''وفاداری بشرط استواری'' کی اعلیٰ مثال بن کر جیتا رہا۔ اس خاکے میں بھی واقعاتی اور کرداری ارتقا بہت نمایاں ہے۔

اس کے علاوہ ''چمنے کہ تا قیامت'' (ڈاکٹر غلام مصطفی خاں)، ''بھائی ولّی'' (اشرف صبوحی دہلوی)، ''اے سارباں آہستہ راں'' (عزیز حامد مدنی)، ''نقشِ جمیل'' (ڈاکٹر جمیل جالبی)، ''عجیب تھیں چارہ گر کی باتیں'' (ڈاکٹر یاور عباس)، ''کس ادا کے ساتھ'' (ادا جعفری)، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' (محب عارفی) اور دیگر کئی خاکے ایسے ہیں کہ قاری کہانی سے بھرپور لطف اٹھاتا ہے اور اپنے تجسّس اور تحیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ایسی وادی کی سیر کو نکل جاتا ہے جہاں حقیقی زندگی کے ان لازوال کرداروں کی رنگا رنگ دنیا آباد ہے۔

محمد حسین آزاد سے ڈاکٹر اسلم فرخی کی زمانی بُعد کی وجہ سے بظاہر ملاقات نہ ہو سکی لیکن وہ ان کے دل کے کتنے قریب تھے۔ اس کا اندازہ اُن کا خاکہ پڑھ کر ہوتا ہے، اوّل تو اس کا آغاز ہی بڑے افسانوی انداز میں ہوا ہے۔

''یہ استاد کے پکھوے سے لگا نیا پکھیرو کون ہے؟ شاید پہلی دفعہ مشاعرے میں آیا ہے۔ بڑا سہما سہما بیٹھا ہے۔ ارے وہی نواب مرزا کی بغل میں۔'' ٭(۲۵)

یہ خاکہ واقعاتی اور کرداری ارتقا بھی بہترین مثال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آزادؔ کی زندگی کے تمام نشیب و فراز ایک دل چسپ کہانی کے پیکر میں سمو دیے ہیں۔ خصوصاً بچپن سے لے کر عہدِ ☆ جنوں تک پہنچتے پہنچتے آزادؔ کے ذہن میں جو گرہیں پڑتی گئیں، اُن کا تجزیہ بڑی مہارت سے

کیا گیا ہے۔ کرداری نفسیات سے آگہی کا کمال دیکھنا ہو تو محمد حسین آزادؔ، باجی آپا اور شوکت بھائی کے کرداروں پر نظر ڈالیے، ڈاکٹر صاحب کی نفسیاتی بصیرت کا قائل ہونا پڑے گا۔

افسانہ ایک طرف تو ہمارے تہذیبی عروج و زوال، ثقافتی مظاہر، سماجی بے حسی، بے راہ روی، قول و فعل کے تضادات، انسانی نفسیات اور عصری کرب کا آئینہ ہوتا ہے اور دوسری جانب یہ ہماری تہذیب کا سچا تاریخی بیانیہ بھی ہوتا ہے۔ ایسا بیانیہ جس کی مثال کوئی دوسرا مورخ پیش نہیں کر سکتا۔٠(۲۶)

تہذیبی اور تاریخی عناصر کی جلوہ آرائی ڈاکٹر صاحب کے خاکوں میں اس طرح نظر آتی ہے جیسے آنکھوں کے سامنے کوئی طلسم خانہ کھل گیا ہو۔ سراپا نگاری اور منظر نگاری کی کئی مثالیں خاکوں کے ان مجموعوں میں بکھری ہوئی ہیں جو نئی نسل کو تہذیبِ رفتہ کے ان گم شدہ نقوش سے آگاہ کرتی ہیں جن کا حسن آج کی تیز رفتار، مادّہ پرست اور مصنوعی زندگی کے مقابلے میں کچھ اور ہی آب و تاب رکھتا تھا مثلاً:

۱۔ ''جاڑوں کا موسم ختم ہوا۔ ایکھ تیار ہے، گیہوں کی فصل پک گئی ہے۔ گاؤں میں بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھے ہیں، رس پک رہا ہے، شہر کے یار دوستوں کے لیے رساول تیار ہو رہی ہے۔'' ٠(۲۷)

۲۔ ''جامے وار کی شیروانی، آڑا پیجامہ، ریشم کا کمر بند، سر پر دوپلّی، بڑے نازک مزاج، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں۔''٠(۲۸)

۳۔ ''برف کو رندے پر چھیلا جاتا تھا، پھر اسے ایک چھوٹے گلاس میں گول کر کے شربت چھڑکا جاتا تھا، ایک پیسے میں ایک گلاس ملتا تھا۔ کبھی روپے دھیلی کے گلاس اڑتے تھے، پھر ملائی کی برف کا شوق پیدا ہوا۔ وہ بھی کیا چیز تھی۔ برف کیا؟ فلالین کی پٹی میں لپٹا ہوا بڑا سا ڈلا۔''٠(۲۹)

نہ صرف یہ کہ تمدنی فضا بلکہ اخلاقی اور تہذیبی اقدار کا جو نگار خانہ ان خاکوں میں سجا ہوا نظر آتا ہے، وہ بھی نسلِ نو کی تربیت کے لیے ایک مثالی نصاب کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کا اپنے شاگردوں کی شوخی، غفلت اور بے شعوری کو نظر انداز کر کے اپنے کردار سے ان کی تربیت کرنا، نذرِ اشرف شیخ ہاشم رضا کا چنبیلی کی مانند اپنی روحانیت کی خوشبو پھیلانا، مولانا

رازق الخیری کا ایک مجاہدانہ شان کے ساتھ اپنے مشن پر قائم رہنا، مشتاق احمد یوسفی کا راجا بھوج بن کر گنگوا تیلی کو راج سنگھاسن پر بٹھا دینا (اگرچہ اپنے آپ کو گنگوا تیلی کہہ کر ڈاکٹر اسلم فرخی نے خود بہت بڑے انکسار کا ثبوت دیا ہے)، لطیف اللہ صاحب کا اپنے بھائی کے رویے سے دل گرفتہ ہو کر اپنا بنا بنایا مکان چھوڑ کر کرائے کے مکان میں اُٹھ آنا، شوکت بھائی کا معذوری کے باوجود اپنی روزی کا ٹھیکرا بے حس بھتیجے کے سپرد کر دینا نیز شاہد احمد دہلوی کی آن بان، سلیم احمد کی صلح پسندی، عزیز حامد مدنی کی درویشی اور قناعت، انجم اعظمی کی خوش گفتاری اور برجستہ گوئی، ڈاکٹر جمیل جالبی کی وضع داری اور مجتبیٰ حسین کی محفل آرائی اور سیر چشمی، مشفق خواجہ کی کتاب شناسی، غرض:

جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

تہذیبی اور تمدنی فضا کے ساتھ ساتھ ان خاکوں میں ہماری ادبی تاریخ بھی مرتب ہوتی نظر آتی ہے، مختلف شخصیات کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا احوال جس طرح ان میں موجود ہے، وہ تاریخی بیانیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ان خاکوں میں کہیں کہیں مکالماتی رنگ بھی موجود ہے جس کی وجہ سے اس میں ڈرامائی عنصر بھی پیدا ہو گیا ہے مثلاً ضمیر الدین احمد کے خاکے کے ابتدائی مکالمے دیکھیے جو خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔

"چوبیس کو تم چلے گئے، ایسی بھی کیا جلدی تھی؟

تم ایسے کھرے کب تھے بھلا داد و شد کے

وہ جو تم میں دوسروں کو چونکانے کا ایک جذبہ، ہیکڑی اور طبیعت میں بے چینی تھی، اُس نے تمھیں دم نہ لینے دیا۔"(۳۰)

افسانے میں اختتام کی بھی بڑی اہمیت ہے، اچھا افسانہ وہی ہوتا ہے جو اختتام کے ساتھ قاری کے دل پر اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ محمد حسین آزاد اور محب عارفی کے خاکے ختم ہوتے ہیں تو قاری کی آنکھیں ضرور نم ہوتی ہیں۔ مثلاً:

(الف) ۱۹۱۰ء کے عشرے کی رات تھی، قیدِ جنوں اور قیدِ حیات دونوں سے چھوٹ گئے،

”نہ جنوں رہانہ پری رہی“ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آگیا، خود چلے گئے۔۔۔ اردو ادب کو آبِ حیات پلا گئے۔“٠(۳۱)

(ب)”محب صاحب کے ہاں بھی یہی ہوا، سارے موتی ختم ہو گئے اور لال سبز کبوتر تتر بتر ہو گئے۔“٠(۳۲)

نذر الحسن صدیقی لکھتے ہیں کہ ”اُن کے خاکوں میں ترتیب و تسلسل کا حسن ارتقا، ابتدا اور اختتام، خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری قریب قریب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض خاکوں میں افسانوں کی چاشنی ہے۔“٠(۳۳)

اردو اور فارسی زبان کے اشعار اور مصرعوں کے بر محل استعمال نے ان خاکوں کو جمالیاتی اظہار سے بھی متصف کیا ہے اور اردو نثر کو بڑے خوب صورت اور لطیف جملوں سے مالا مال کیا ہے۔ مثلاً:

شہرت کا حال بھی خوش بو جیسا ہے۔ بعض خوش بوئیں ہلکی، بھینی اور مدھم ہوتی ہیں۔ بعض تیز، بعض بہت تیز اور اعصاب شکن۔٠(۳۴)

ہماری غفلت کی تند و تیز آندھی نے خاک بھی باقی نہیں رکھی۔٠(۳۵)

روز افزوں آلودگی کے اس ماحول میں شیریں چشمے بڑی تیری سے ختم ہوتے جارہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صرف آلودگی ہی آلودگی باقی رہ جائے اور آبِ شیریں کے چشمے چشمۂ آبِ حیات کی طرح نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔٠(۳۶)

ڈاکٹر صاحب کے خاکوں میں زبان و بیان کے بہت سے اشارے ایسے ہیں جن سے نئی نسل کے لکھنے پڑھنے والے اپنے علم میں اضافہ کرسکتے ہیں مثلاً ”حکیم چٹکلے باز“ سے یہ اقتباس دیکھیے:

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب، کمال ہے۔ اردو والے صنائع لفظی کو کبھی نہیں بھولتے۔ آپ نے بھی ”نامی“ اور ”مانی“ میں صنعتِ تجنیس کا حسن بر قرار رکھا ہے اور ڈاکٹر کے مقابلے میں حکیم

سے صنعتِ طباق کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔○(۳۷)

اگرچہ ان خاکوں پر اور بھی کئی پہلوؤں سے بات ہو سکتی ہے لیکن خاص طور پر تہذیبی و تمدنی اقدار کی منتقلی کے لیے ڈاکٹر صاحب نے زبان کو ایک اہم آلے کے طور پر استعمال کیا ہے، اگر صرف ان الفاظ اور محاورات کی ایک فہرست ہی تیار کرلی جائے جو ہمارے شان دار تہذیبی ورثے کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان خاکوں میں شامل ہیں تو ڈاکٹر اسلم فرخی کی زبان دانی کے کمالات سامنے آجائیں گے لیکن زبان دانی کے یہ کمالات مصنوعی اور ارادی نہیں بلکہ ان کی تہذیبی شخصیت کا آئینہ بھی ہیں اور ایک کامیاب افسانہ نگار کی طرح اُن کی قوتِ مشاہدہ کا ثبوت بھی ہیں۔ لہٰذا اُنھوں نے خاکہ نگاری میں جو الگ راہ نکالی، وہ دراصل اُن کے افسانوی اسلوب کا ہی کمال ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اب خود کسی خاکے کا عنوان بن گئے لیکن زندگی کے حقیقی اداروں کو افسانوی رنگ سے ہم آہنگ کرکے اردو خاکہ نگاری میں ایک روشن باب کا اضافہ کرگئے۔

حواشی

۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، تبصرہ، خاکہ نگاری: فن و تنقید، ڈاکٹر بشیر سیفی مشمولہ سہ ماہی ''ادبیات''، اسلام آباد، سرما، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱۲

۲۔ کندیانی، امجد، اردو میں خاکہ نگاری (مضمون) مشمولہ ''نگار'' پاکستان، کراچی، سال نامہ، ۱۹۶۶ء، ص ۲۲۴

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۴۔ یہ گیارہ خاکے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وقتاً فوقتاً نشر ہوئے جن میں راشد الخیری، حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، چکبستؔ، داغؔ، پریم چند، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، علامہ اقبالؔ، سر راس مسعود اور مولانا محمد علی جوہرؔ کی شخصیات کو موضوع بنایا گیا۔

۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، محولہ بالا۔

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، خطبۂ صدارت برائے تقریب ''ڈاکٹر اسلم فرخی کے ساتھ ایک شام''، مشمولہ سہ ماہی ''کہکشاں''، اکتوبر دسمبر، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱۳

۷۔ سحر انصاری، پروفیسر، روشنی کا سفر: ڈاکٹر اسلم فرخی''، ایضاً

۸۔ ''نگارستانِ آزاد'' جنوری ۲۰۱۰ء میں آزادؔ کی صد سالہ برسی کے موقعے پر شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے محمد حسین آزاد کی تحریروں کا انتخاب پیش کیا ہے اور کتاب کے آغاز میں ''محمد حسین آزاد: خواندہ، شنیدہ اور فہمیدہ'' کے عنوان سے ستاون صفحات کا ایک خاکہ بھی موجود ہے۔

۹۔ شجاع احمد زیبا، پروفیسر، ''اردو میں قلمی خاکے''، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۲

۱۰۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''نظام رنگ''، احسن مطبوعات، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۷

۱۱۔ ایضاً، ''نگارستانِ آزاد''، شہرزاد، کراچی، ص ۱۵

۱۲۔ ایضاً، ''سات آسمان''، ایضاً، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۴۔ ایضاً، ''سیر آخری درویش کی'' مشمولہ ''رونقِ بزمِ جہاں''، ایضاً، ۲۰۱۴ء، ص ۷

۱۵۔ ایضاً، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، ایضاً، ۲۰۰۵ء، ص ۹

۱۶۔ ایضاً، ''چمنے کہ تا قیامت'' مشمولہ ''گل دستۂ احباب''، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰

۱۷۔ ایضاً، ''میں فرشتہ تو نہیں''، ایضاً، ص ۲۴۸

۱۸۔ ایضاً، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' مشمولہ ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، ایضاً، ص ۲۸۸

۱۹۔ ایضاً، ''پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر'' مشمولہ ''آنگن میں ستارے''، ایضاً، ۲۰۰۱ء، ص ۹

۲۰۔ ایضاً، ''ثناخوانِ حق''، ایضاً، ص ۱۰۷

۲۱۔ ایضاً، ''جانِ بے تاب'' مشمولہ ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، ایضاً، ص ۱۳۳

۲۲۔ ایضاً، ''لذت آشنائے تلخیِ دوراں''، ایضاً، ص ۱

۲۴۔ ایضاً، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، ایضاً، ص ۲۷

۲۵۔ ایضاً، ''نگارستانِ آزاد''، ایضاً، ص ۱۱

۲۶۔ رؤف نیازی، ''کچھ صورت گر افسانوں کے''، احمد برادرز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

۲۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''لذت آشنائے تلخیِ دوراں'' مشمولہ ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، ایضاً، ص ۴۲

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۲

۲۹۔ ایضاً، ''ضمیر منیر دوست'' مشمولہ ''گل دستۂ احباب''، محولہ بالا، ص ۲۳۱

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۳۱۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''نگارستانِ آزاد''، ص ۵۷

۳۲۔ ایضاً، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، ص ۳۰۲

۳۳۔ صدیقی، نذر الحسن، ''ڈاکٹر اسلم فرخی: شخصیت اور فن'' مشمولہ سہ ماہی ''کہکشاں''، کراچی، اکتوبر

دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۴

۳۴۔ ایضاً، ''صاحبِ فہم وذکا''مشمولہ ''موسمِ بہار جیسے لوگ''، شہرزاد، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۵

۳۵۔ ایضاً، ''بادیہ پیمائے آزاد''، ایضاً، ص ۱۳۲

۳۶۔ ایضاً، ''اے ساربان آہستہ راں، ''گل دستۂ احباب''، محولہ بالا، ص ۱۸۶

۳۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''حکیم چٹکلے باز''مشمولہ ''آنگن میں ستارے''، ایضاً، ص ۱۳۳

محمد صابر جمیل☆

ڈاکٹر اسلم فرخی کے دو غیر مطبوعہ خط بنام مرزا ظفر الحسن

مرزا ظفر الحسن ۱۹۱۶ء میں سنگاریڈی (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ وسطانیہ سرکارِ عالی میں مڈل تک حاصل کی۔ مڈل پاس کرنے کے بعد حیدرآباد دکن آگئے اور سٹی ہائی اسکول سے میٹرک اور سٹی کالج سے ایف اے کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے بی اے کیا۔ آپ اسٹیج ڈراموں اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ریڈیو دکن سے تعلق رہا مگر سقوطِ حیدرآباد دکن کے بعد آپ نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا اور جنوری ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے۔ پاکستان میں دوبارہ ریڈیو سے منسلک ہوئے تو انھیں پشاور تعینات کیا گیا اور پانچ سال بعد ان کا تبادلہ کراچی میں ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں الیکشن کمیشن میں درجۂ اوّل کے افسر بنے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۲ء تک الیکشن کمیشن میں خدمات انجام دیتے رہے اور اپنی ملازمت کے دوران ڈپٹی کمشنر کے عہدے تک پہنچے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ”ادارۂ یادگارِ غالب“ کا قیام ہے۔ آپ کی اہم کتابوں میں ”دکن اداس ہے یارو“، ”تماشائے اہلِ کرم“، ”ذکرِ یار چلے“، ”پھر نظر میں پھول مہکے“، ”عمرِ گزشتہ کی کتاب“ اور ”صلیبیں میرے دریچے میں“ شامل ہیں۔ ”عمرِ گزشتہ کی کتاب“ سے اُن کے روابط فیض احمد فیضؔ اور مخدومؔ محی الدین اور ساتھ ہی ساتھ ترقی پسند تحریک سے اُن کی وابستگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ یہاں مرزا ظفر الحسن کی اس تحریر سے ڈاکٹر صاحب سے اُن کے تعلق کا ایک ثبوت ملتا ہے:

”ادارۂ یادگارِ غالب میں میرے نوجوان شریک کار اور اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب سحر انصاری نے مشورہ دیا بلکہ اصرار کیا کہ میں اپنی دوسری کتاب کو محض اپنی یادوں تک محدود کرنے کے بجائے اس میں وسعت پیدا کروں۔ یہی بات ممتاز ادیب اور استاد اور ریڈیو میں میرے

☆ استاد شعبۂ اردو، گورنمنٹ سپیریئر سائنس کالج، شاہ فیصل کالونی، کراچی

رفیق کار ڈاکٹر اسلم فرخی نے بھی کہی۔"(۱)

درجِ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو پاکستان سے مرزا صاحب اور ڈاکٹر صاحب کا تعلق کتنا گہرا تھا۔ اس کے علاوہ غالب لائبریری سے ڈاکٹر صاحب کی قلبی وابستگی اور علم وادب میں ہونے والے کاموں پر آپ کی گہری نظر تھی جس وجہ سے مرزا ظفر الحسن سے آپ کا رابطہ مسلسل رہتا تھا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی محقق، استاد، خاکہ نگار، براڈکاسٹر اور شاعر تو تھے ہی مگر آپ کے خطوط دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نجی زندگی میں بھی کسی بناوٹ اور تصنع کا شکار نہیں ہیں بلکہ صاف، سادہ اور واضح تحریر آپ کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے دو غیر مطبوعہ خط جو مرزا ظفر الحسن (معتمد ادارۂ یادگار غالب، کراچی) کو لکھے گئے تھے، ادارۂ یادگارِ غالب کے شکریے کے ساتھ نذر قارئین ہیں۔

درجِ ذیل خط میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے مجلہ "غالب" اور اس میں شائع ہونے والے خاص مضامین کا ذکر کرتے ہوئے تعریف کی ہے اور ساتھ ہی اس بات کا اندیشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ کہیں "غالب" بند نہ ہو جائے۔ پہلا خط جو ۱۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو لکھا۔ ملاحظہ ہو:

۱۵/۳/۷۵[۱۹ء]

مکرمی مرزا صاحب السّلام علیکم

سحر صاحب(۲) کے ذریعے سے "غالب"(۳) پہنچا۔ کاش آپ وقت سے بہت پہلے ریٹائر ہو کر یہ کاروبار شروع کر دیتے۔ مومن کے بارے میں یہ سُنا تھا کہ اُس کی آن اور شان ہر لمحے نئی ہوتی ہے لیکن آپ کی آن اور شان کو بھی ہر لحظے نیا پایا اور یہ باور کرنا پڑا کہ کافر بھی مومن ہو سکتا ہے۔ پرچے کو ہر اعتبار سے پسندیدہ اور قابل تعریف پایا۔ فیض صاحب کا مضمون۔(۴) مشفق خواجہ کا مضمون(۵) اور آپ کا مرتب کردہ ابن انشا کا مضمون(۶) یہ سب ہی خاصے کی چیز ہیں اور اس بات کی داد نہ دینا بھی بے انصافی ہو گی کہ بعض مضامین آپ نے کتنی احتیاط سے چھپا کر رکھے تھے اور کیسے سلیقے سے پیش کیے۔ بہر حال، حسن ذوق، نفاست طبع، ادبی دید و دریافت ہر اعتبار سے غالب کو غالب ہی پایا۔

مرزا صاحب یہ سب باتیں تو آپ کو بڑی بھلی معلوم ہوئی ہوں گی اب ذرا دو چار تلخ باتیں بھی سُن لیجیے۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ غالب کی اشاعت میں "ساہوکار کا دخل" بڑھنا شروع نہ

ہو جائے اور ہم سب ایک اچھے ادبی مُجلّے سے محروم نہ ہو جائیں۔ آپ نے بڑے حوصلے سے کام لیا ہے مگر صورت حال یہ ہے کہ ادبی رسالے سسک رہے ہیں۔ بہتوں نے دم توڑ دیا ہے۔ بہتیرے نہیں بلکہ جو گنے چنے باقی رہ گئے ہیں ان پر نزع کا عالم طاری ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے ہم سب کو غیر معمولی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ مایوس ہو کر ہاتھ پیر ڈالنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر کے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا پڑے گا۔ ادبی ذوق کی ترویج واشاعت اور قارئین کا حلقہ وسیع کرنے کے لیے محنت سے کام لینا ہو گا۔ آپ اس کے اہل ہیں۔ قدم اُٹھائیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ غالب کو زندہ رہنا ہے۔ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنا ہے۔ آپ نے پرچہ نکالا ہے تو پھر اسے زندہ رکھنے کی مہم بھی چلائیے۔ ایک جائزہ علمی اور تحقیقی یوں بھی سہی کہ ادبی پرچے تادیر جاری کیوں نہیں رہتے۔ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں اور دونوں سے رائے لیجیے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہمت کر کے کسی شام یونی ورسٹی آجائیں۔ غالب لائبریری کے لیے بہت کچھ جمع کر رکھا ہے۔

نیاز مند

اسلم فرخی

دوسرا خط ۲۶ نومبر ۱۹۷۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس خط میں ڈاکٹر اسلم فرخی شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ میں ہونے والے علمی و ادبی کاموں کے حوالے سے آگاہ کر رہے ہیں اور مجلہ ''جریدہ'' کی اشاعت کے حوالے سے بتا رہے ہیں اور ساتھ ہی مرزا صاحب سے درخواست کر رہے ہیں کہ کچھ وقت نکال کر شعبے میں آیئے اور ان کاموں کو ملاحظہ فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیے۔

۲۶ / نومبر ۱۹۷۹ء

مخدومی مکرمی، السلام علیکم

آپ کو غالباً اس بات کا علم ہو گا کہ جامعہ کراچی کا شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ عرصہ دراز سے علمی خدمت انجام دے رہا ہے۔ شعبے نے اردو میں علمی اصطلاحیں وضع کرنے کے سلسلے میں کافی کام کیا ہے اور متعدد علوم و فنون کی اصطلاحوں کے تراجم بھی شائع کیے ہیں۔ شعبہ ایک رسالہ بھی ''جریدہ''(۷) کے نام سے شائع کرتا ہے جس میں مختلف علوم کی اصطلاحوں کے ترجمے شائع کیے جاتے ہیں۔

وضع اصطلاحات کے علاوہ شعبے نے وقیع سائنسی کتابوں کے تراجم شائع کرنے کا اہتمام

بھی کیا ہے۔ شعبے نے سائنسی تراجم کے علاوہ بعض طبع زاد علمی کتابیں بھی شائع کی ہیں جنھیں ملک اور بیرون ملک قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔

آپ کے علمی شغف اور ذوق کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ وقت نکال کر اس شعبے کو بھی ملاحظہ کیجیے۔ جو کام انجام دیا جارہا ہے اسے دیکھیے۔ ہماری رہنمائی فرمایئے اور ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمیں ملک کے تمام اربابِ دانش کا تعاون اور سرپرستی حاصل رہے تاکہ ہم علمی سطح پر ملک و قوم کی بہتر خدمت انجام دے سکیں۔

ہمیں امید ہے کہ آپ جلد اپنی تشریف آوری کی تاریخ اور وقت سے مطلع فرمائیں گے۔ ہمیں آپ کی تشریف آوری اور مشوروں کا انتظار ہے۔

نیاز مند

اسلم فرخی

حواشی

۱۔ ظفرالحسن، مرزا، پھر نظر میں پھول مہکے (ذکرِیار چلے کی طرح دکن کی یادوں کا مجموعہ)، کتب پرنٹرز و پبلشرز لمیٹڈ، کراچی، اپریل ۱۹۷۴ء

۲۔ پروفیسر سحر انصاری۔

۳۔ یہاں غالب سے مراد ادارۂ یادگارِ غالب کا ادبی مجلہ ''غالب'' ہے۔ اس کا پہلا شمارہ ''جلد ا، شمارہ ا۔ جنوری تا مارچ ۱۹۷۵ء، میں شائع ہوا تھا جس کے مدیر اعلیٰ فیض احمد فیض اور مدیر مرزا ظفرالحسن تھے۔

۴۔ فیض احمد فیض کا یہ مضمون ''غالب'' جلد ا، شمارہ ا، جنوری تا مارچ ۱۹۷۵ء میں بعنوان صفحاتِ فیض (اردو شاعری) شائع ہوا۔ ص ۷ تا ۱۰۔

۵۔ مشفق خواجہ کا یہ مضمون ''غالب'' جلد ا، شمارہ ا، جنوری تا مارچ ۱۹۷۵ء میں بعنوان ''پرانے شاعر نیا کلام (جسونت سنگھ پروانہ) شائع ہوا۔ ص ۸۲ تا ۱۱۷۔

۶۔ ابن انشا کا یہ مزاحیہ مضمون ''غالب'' جلد ا، شمارہ ا، جنوری تا مارچ ۱۹۷۵ء میں بعنوان ''شاعری کر مشاعرے میں ڈال'' شائع ہوا جسے مرزا ظفرالحسن نے مرتب کیا تھا۔ ص ۳۵ تا ۵۶

۷۔ شعبۂ تصنیف، تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی سے شائع ہونے والا پہلا شمارہ ''جریدہ'' ہے۔

سیّد جمیل احمد رضوی☆

ڈاکٹر اسلم فرخی مرحوم چند خطوط کے آئینے میں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس مضمون کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ محمد احسن خان صاحب فون پر راقم السطور سے رابطہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھے ۱۶/ جون ۲۰۱۶ء کو فون پر یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ کل بہ تاریخ ۱۵/ جون ۲۰۱۶ء ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ میری زبان پر بے ساختہ یہ کلمات جاری ہو گئے: اناللہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے ان کو بتایا کہ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کے چند خطوط محفوظ ہیں۔ میں نے مرحوم کی نفاستِ طبع اور شائستہ اطوار کا ذکر بھی کیا۔ چند روز کے بعد خان صاحب نے مجھے فون پر بتایا کہ ''قومی زبان'' میں گوشۂ ڈاکٹر اسلم فرخی شائع ہو رہا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے مجھے ایک مضمون لکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پاس ان کے جو خطوط موجود ہیں، ان کے حوالے سے ایک مضمون لکھ دوں گا۔ چنانچہ محمد احسن خان صاحب کی تحریک اور تشویق پر یہ مختصر تحریر قارئین کی نذر ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے مجھے پانچ خطوط ۱۹۹۰ء میں لکھے۔ اس وقت آپ ''انجمن ترقیِ اردو پاکستان'' کراچی کے مشیرِ علمی و ادبی تھے۔ انھوں نے ایک خط ۱۹۹۳ء میں لکھا۔ یہ تعزیتی خط ہے جو مرحوم نے میری جواں سال بیٹی (راشدہ زہرا) کی وفات پر لکھا تھا۔ یہاں پر یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری مارچ ۱۹۸۸ء میں قائداعظم کیمپس (نیو کیمپس) میں نئی عمارت میں منتقل ہونا شروع ہوئی تھی۔ جون کے آخر تک منتقلی کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ راقم السطور اس وقت لائبریری کے شعبۂ علومِ شرقیہ (اورینٹل سیکشن) کا انچارج تھا اور بہ حیثیت ڈپٹی چیف لائبریرین فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ اس سے پہلے میری ڈاکٹر صاحب سے خط و کتابت نہیں تھی۔ یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو، علامہ اقبال کیمپس (اولڈ کیمپس) میں ہی تھا۔ یہ شعبہ اب بھی وہیں یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں کام کر رہا ہے۔ اس زمانے میں پروفیسر رفیع الدین

☆ سابق چیف لائبریرین، پنجاب یونی ورسٹی لائبریری، ۱۱-بی، نیو شالیمار ٹاؤن، ملتان روڈ، لاہور، ۵۴۵۰۰

ہاشمی صاحب شعبۂ اردو میں پڑھاتے تھے۔ یہ غالباً جولائی ۱۹۹۰ء کا واقعہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے مجھے ایبٹ آباد سے ایک مکتوب ارسال کیا جس میں ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی ایک علمی ضرورت کا ذکر کیا اور مجھے اس سلسلے میں تعاون کرنے کے لیے لکھا۔ ہاشمی صاحب کا یہ مکتوب بہت اہم ہے۔ اس کو ذیل میں منتقل کیا جاتا ہے:

برادرم جمیل رضوی صاحب!

سلامِ مسنون! ایک روز فون پر آپ سے بات چیت ہوئی مگر نامکمل—دوسرے روز پھر ناکام کوشش کی۔ معاً بعد، میں سفر پر

نکل آیا—مسئلہ یہ ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب (کراچی) کو ''مضامینِ فراق'' از خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی کی تلاش ہے۔ معلوم ہوا کہ کتاب آپ کے ہاں ہے، کیٹلاگ کارڈ ہے مگر اصل کتاب کہاں ہے؟ پتا نہیں چل سکا۔

براہِ کرم زحمت کر کے کتاب تلاش کروایئے، اگر مل جائے تو اس کی فوٹو کاپی اور کراچی ترسیل کے اخراجات کا تخمینہ لگا کر، ڈاکٹر فرخی صاحب کو براہِ راست کراچی خط لکھ دیجیے۔ اور صورتِ حال سے مجھے بھی مطلع کر دیں تو ممنون رہوں گا۔

خدا کرے آپ بہ خیر ہوں—میں ابھی چند ہفتے یہاں مقیم رہوں گا۔ والسلام

خیر اندیش

رفیع الدین ہاشمی

میں نے ہاشمی صاحب کی تحریر کے مطابق کتاب کو تلاش کروایا اور پھر فرخی صاحب کو اطلاع کر دی۔ انھوں نے ۲۲؍ جولائی ۱۹۹۰ء کو انجمن کے لیٹر ہیڈ پر مجھے ایک خط ارسال کیا۔ یہ انجمن کے مشیر علمی و ادبی کی حیثیت سے لکھا گیا ہے اور اس پر نمبر اور تاریخ درج ہے۔ یہ خط یہاں پر نقل کیا جاتا ہے:

مکرمی، السلام علیکم!

گرامی نامہ ملا۔ میں بڑا ممنون ہوں کہ آپ نے توجہ فرمائی اور خواجہ ناصر نذیر فراق کے مضامین کا پتا لگا لیا۔ مبلغ چالیس روپے کا منی آرڈر ارسال کیا گیا ہے۔ ازراہِ نوازش فوٹو اسٹیٹ بھجوا دیجیے۔

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔

نیاز مند
ڈاکٹر اسلم فرخی
مشیر علمی و ادبی

جب زیرِ حوالہ فوٹو اسٹیٹ ڈاکٹر صاحب کو کراچی میں مل گیا تو انھوں نے مجھے ۱۳/ اگست ۱۹۹۰ء کو ایک خط بھیجا۔ گویا یہ وصولی کی رسید ہے۔ یہ مکتوب اسی حیثیت سے لکھا گیا۔ اس پر نمبر اور تاریخ بھی درج ہے۔ اس کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

مکرمی، السلام علیکم!

گرامی نامہ اور 'مضامینِ فراق' کا فوٹو اسٹیٹ موصول ہوا۔ شکریہ قبول فرمایئے۔ اُمید ہے کہ منی آرڈر پہنچ گیا ہو گا۔

اُمید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

نیاز مند
ڈاکٹر اسلم فرخی
مشیر علمی و ادبی

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے ۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو مجھے ایک خط بھیجا۔ یہ بھی انجمن کے مشیر علمی و ادبی کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ اس پر بھی نمبر اور تاریخ درج ہے۔ اس خط کو بھی نیچے درج کیا جاتا ہے:

مخدومی مکرمی، السلام علیکم!

آپ کا گرامی نامہ اور ڈاک کے ٹکٹ موصول ہوئے۔ آپ نے یہ ٹکٹ بھیج کر مجھے شرمندہ کیا۔ ''حسابِ دوستاں در دل'' والی بات ہے۔ ایک زحمت اور دینا چاہتا ہوں۔ حضرت امیر خسروؒ کا ایک دیوان ''نہایت الکمال'' بہت عرصہ ہوا دلّی سے شائع ہوا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ یہ آپ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس دیوان میں وہ مرثیہ بھی موجود ہے جو امیر خسروؒ نے قطب الدین مبارک شاہ کے مرنے پر لکھا تھا۔ اگر آپ کے لطف و کرم سے اس مرثیے کا ایک فوٹو

اسٹیٹ حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔

کارِ لائقہ سے یاد فرمایئے۔

نیاز مند

(ڈاکٹر اسلم فرخی)

مشیر علمی و ادبی

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے ۳۰ر نومبر ۱۹۹۰ء کو مجھے ایک خط ذاتی حیثیت میں لکھا۔ اس پر آپ کی رہائش گاہ بی ۱۵۵ / ۵، گلشنِ اقبال، کراچی کا پتا چھپا ہوا ہے۔ اس خط میں مجھے دو کتابیں بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ خط درجِ ذیل ہے:

مخدومی مکرمی، السلام علیکم!

میں بڑا ممنون ہوں کہ آپ نے قطب الدین مبارک شاہ کے مرثیے کی نقل ارسال فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند، مسرور اور مطمئن رکھے اور آپ اسی لگن سے علمی کام کرنے والوں کی اعانت کرتے رہیں۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل کی کتاب کا ایک نسخہ آپ کے ملاحظے کے لیے ارسال ہے۔ اسے میری جانب سے حقیر ہدیہ سمجھیے۔ اگر کسی اور کتاب کی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے لکھیے۔ میں اپنی ایک تالیف ''فریدؒ و فردِ فرید'' بھی آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔

نیاز مند

(ڈاکٹر اسلم فرخی)

ڈاکٹر اسلم فرخی نے جو دو کتابیں مجھے بھیجی تھیں، میں نے اُن کو دیکھا اور ان کی تالیف ''فریدؒ و فردِ فرید'' کا ایک ہی نشست میں مطالعہ کر لیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اُن کو ایک مفصل خط ۲۸ر نومبر ۱۹۹۰ء کو ارسال کیا۔ اپنے اس خط کو یہاں پر نقل کر رہا ہوں تا کہ

محفوظ ہو جائے اور ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے بارے میں میرے تاثرات بھی معلوم ہو جائیں۔

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! آپ کا مکتوب موّرخہ ۲۰؍ نومبر ۱۹۹۰ء کل وصول ہوا۔ ''پاکستان میں اردو تحقیق'' از ڈاکٹر معین الدین عقیل کا ایک نسخہ بھی ملا۔ اس کے ساتھ آپ کی تازہ کتاب ''فریدؒ و فردِ فریدؒ'' کا ایک نسخہ بھی وصول ہوا۔ میں اس کرم فرمائی کے لیے آپ کا ازحد ممنون ہوں۔ خداوندِ عالم جزائے خیر دے۔

''فریدؒ و فردِ فریدؒ'' میں آپ نے شیخ الاسلام فرید الدین مسعودؒ اور شیخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کے روحانی سفر کی روداد انتہائی دل چسپ اور مربوط انداز میں پیش کی ہے۔ میں کل شام اس کتاب کو لے کر بیٹھا اور ایک ہی نشست میں اس کو پڑھ لیا۔ تاریخی واقعات کو اس حسنِ سلاست اور روانی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ پوری کتاب پڑھے بغیر اس کو چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہتا:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جاست

اس کو حسنِ اتفاق یا کمالِ حسنِ اتفاق کہیے کہ میں ان دنوں خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے بارے میں پنجاب یونی ورسٹی لائبریری کے حوالے سے ''فریدی ادب'' پر ایک کتابیاتی مضمون (Bibliographical Article) لکھ رہا ہوں۔ آپ کی تالیف کے مطالعے سے اس بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوا اور اس سمت ایک نئی روشنی نظر آئی۔ آپ کے اسلوبِ تحریر اور اندازِ بیان نے بہت خوش گوار اثر چھوڑا۔ خداوندِ عالم آپ کی توفیقات میں مزید اضافہ کرے تاکہ آپ سلسلۂ نظامیہ کے بارے میں اور تالیفات سے قارئین کو مستفید فرمائیں۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو لکھیے گا۔ اللہ کرے آپ کے مزاج بخیر ہوں۔

والسلام مع الاکرام

مخلص

سیّد جمیل احمد رضوی

ڈپٹی چیف لائبریرین

ڈاکٹر صاحب نے ۱۰/ دسمبر ۱۹۹۰ء کو ایک مکتوب ارسال کیا۔ اس میں اُنھوں نے اس روحانی تعلق کا ذکر کیا ہے جو اُن کو حضرت سلطان المشائخ کے ساتھ تھا۔ ۱۹۷۸ء سے ہر سال شیخ کے عرس میں حاضر ہونے کے متعلق بھی لکھا ہے۔ یہ خط ان کی قلبی کیفیت کا اظہار بھی کرتا ہے جو بوجوہ ۱۹۹۰ء میں عرس میں حاضر نہ ہونے سے ان پر وارد ہوئی۔ اس خط کو بھی یہاں پر نقل کیا جاتا ہے۔ یہ خط بھی انجمن کے لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا ہے:

مخدومی، السلام علیکم!

گرامی نامہ موصول ہوا۔ میں بڑا ممنون ہوں کہ آپ نے "فریدؒ و فردِ فریدؒ" کے بارے میں ایسے حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ ایک ناچیز کوشش کو آپ نے اتنا سراہا۔

۷۸ء (۱۹۷۸ء) سے بارگاہِ سلطان المشائخ میں مسلسل حاضری ہوتی رہی۔ پاکستانی زائر کی حیثیت سے ہر سال عرس میں شرکت کے لیے حاضری دیتا تھا۔ اس سال بھی وزارتِ امورِ مذہبی کے قافلے میں شامل تھا مگر لاہور پہنچ کر یہ خبرِ وحشت اثر ملی کہ ہندوستان میں ہونے والے فسادات کی وجہ سے زائرین کی حاضری منسوخ کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کسی سے ملے جلے بغیر چپ چاپ لاہور سے واپس آ گیا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم یہی تھا۔ لاہور میں ٹھہرتا تو آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا۔

فریدی ادب پر آپ کے کتابیاتی مضمون کا اشتیاق ہے۔ مکمل ہو تو ارسال فرمایئے تاکہ میں استفادہ کر سکوں۔ (۱) سلسلۂ نظامیہ کی دوسری کتاب "صاحب جی سلطان جی" بھی آپ کے مطالعے کے لیے ارسال ہے۔ افسوس ہے کہ "نظام رنگ" کا کوئی نسخہ اب دستیاب نہیں ورنہ وہ بھی خدمت میں روانہ کرتا۔

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے۔

نیاز مند
(ڈاکٹر اسلم فرخی)
مشیر علمی و ادبی

زیرِ نظر کتاب وصول ہونے پر میں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ فریدی ادب کے متعلق اپنے کتابیاتی مضمون کی وضاحت بھی کی۔ اس خط کو بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جو موّرخہ ۸؍ جنوری ۱۹۹۱ء کو تحریر کیا گیا۔

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا مکتوب موّرخہ ۱۰؍ دسمبر ۱۹۹۰ء وصول ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کتاب ''صاحب جی سلطان جی'' مل گئی تھی۔ اس کرم کے لیے بہت ممنون ہوں۔ دسمبر میں ایک عشرے کے لیے فیصل آباد جانا پڑا۔ اس وجہ سے جلد جواب ارسال نہ کر سکا۔

میں نے ''صاحب جی سلطان جی'' کو بھی ایک ہی نشست میں پڑھ لیا تھا۔ اس کے مطالعے سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ آپ کی تحریر تو ہمیشہ خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔ خداوندِ عالم آپ کی توفیقات میں مزید اضافہ کرے تاکہ آپ ایسا ادب تخلیق کرتے رہیں جو روحانی غذا کا کام دیتا ہے اور سیرت سازی میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

''اظہار سنز'' والے اپنے پرچے ''جدید ادب'' کا ''بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نمبر'' نکال رہے ہیں۔ میں نے ایک مضمون بعنوان ''پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں فریدی ادب (منتخب کتابیات)'' لکھا ہے۔ اِن شاء اللہ یہ مضمون اس میں شائع ہو گا۔ شائع ہونے پر آپ کو یہ خصوصی شمارہ بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ (۲)

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو لکھیے گا۔

والسلام مع الاکرام

مخلص

سیّد جمیل احمد رضوی

ڈپٹی چیف لائبریرین

ڈاکٹر صاحب کا آخری خط ۲۸؍ جنوری ۱۹۹۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ تعزیتی مکتوب ہے جو راقم السطور کی جواں سال بیٹی (راشدہ زہرا) کی وفات کی خبر پا کر فرخی صاحب نے لکھا۔ یہ فرخی صاحب نے اپنے رہائشی لیٹر ہیڈ، بی-۱۵۵/۵، گلشنِ اقبال، کراچی پر لکھا۔ میری بیٹی کا انتقال ۱۶؍

۸

دسمبر ۱۹۹۲ء کو میو اسپتال، لاہور میں ہو گیا تھا۔(۳)

ڈاکٹر صاحب کو بذریعہ خط اس سانحے کی اطلاع دی گئی تھی۔ انھوں نے درجِ ذیل خط مجھے ارسال کیا۔

۷۸۶

حامداً و مصلّیاً

مخدومی سیّد صاحب، السلام علیکم!

گرامی نامہ ابھی ملا۔ بیٹی کی وفات کی اطلاع پڑھ کر دل پر ایک سناٹا گزر گیا۔ بڑی تکلیف ہوئی۔ انسان کا کچھ بس نہیں چلتا۔ پالتا پوستا ہے، پڑھاتا لکھاتا ہے، بیاہ شادی کرتا ہے اور پھر اپنے ہی ہاتھوں مٹی کے سپرد کر آتا ہے۔ والدہ کے حوالے سے ایک نظم لکھی ہے، اس کا ایک شعر نذر کرتا ہوں:

آج اپنے ہی ہاتھوں تجھے مٹی میں دبا آئے
کل تک ترے جینے کی دعا مانگ رہے تھے

اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ صبر کے لیے کیا لکھوں۔ اور کیا ہے بجز صبر۔ اللہ تعالیٰ کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی، ہمارا کیا زور۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔

آپ کا شریکِ غم

اسلم

یہ خط ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلم سے لکھا۔ اس تعزیتی خط کو پڑھ کر صدمہ برداشت کرنے کا بہت حوصلہ ملا۔

اب آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں

جگہ دے اور اُن کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے۔

حواشی

۱۔ یہ مقالہ لائبریری سائنس کے ایک پرچے میں ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا مکمل کتابیاتی حوالہ (Bibliographical Citation) درجِ ذیل ہے:
سیّد جمیل احمد رضوی، ''پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں فریدی ادب (منتخب کتابیات)''، مشمولہ سہ ماہی ''خبر نامہ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن (پنجاب)، لاہور، جلد ۴، شمارہ ۱–۴ (۱۹۹۴ء)، ۱۰–۲۱
بعد میں میاں زبیر احمد علوی صاحب کے کہنے پر اس مقالے میں اضافے کیے گئے۔ میاں صاحب نے اس کو ۲۰۱۴ء میں کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کی کتابیاتی تفصیل درجِ ذیل ہے:
''سیّد جمیل احمد رضوی، ''پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں فریدی ادب (منتخب کتابیات)''، لاہور، دارالفیض گنج بخش، ۲۰۱۴ء، ص ۵۲۔

۲۔ یہ مقالہ ''جدید ادب'' میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کی وضاحت حوالہ نمبر ۱ میں کر دی ہے۔

۳۔ جواں سال بیٹی کی وفات پر کئی احباب نے قطعاتِ تاریخِ وفات منظوم کر کے بھیجے۔ معروف شاعر، محقق اور ادیب کسریٰ منہاس مرحوم (م: ۲۹/ نومبر ۱۹۹۵ء) نے بھی قطعۂ تاریخِ وفات لکھا۔ اس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

غفور لم یزلی

۱۴۱۳ھ

چل بسیں دخترِ جمیل اے آہ — دارِ فانی سے سوِ ملکِ بقا
ماتم سخت ہے جواں مرگی — ہر طرف ہے صدائے واویلا
جن کے دم سے یہ گھر تھا بقعۂ نور — ہائے وہ بجھ گئی ہے شمعِ حیا
والدین ان کے غم سے ہیں نڈھال — مرے مولا انھیں ہو صبر عطا

سالِ رحلت ہے مصرعِ کسریٰ
داخلِ خلد، راشدہ زہرا

۱۹۹۲ء

ارمان نجمی

ڈاکٹر اسلم فرخی مسندِ علم و ادب خالی کر گئے

یہ جملہ لکھتے ہوئے مجھے انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ اردو کے صاحبِ طرز ادیب، شاعر، براڈکاسٹر، علمی صلاحیت سے مالا مال، مدبر مدیر، استاذ اور انشا پرداز کراچی میں انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ میں کبھی کبھی انہیں یاد کر کے سوچتا تھا کہ شاید وہ اردو کے واحد ایسے ادیب کی حیثیت سے جانے جائیں گے جنھیں مشہور و معروف بنگالی نژاد ادیب و مفکر نراد چندر چودھری کی مانند سو برس سے زیادہ زندہ رہنے کی سعادت ملی۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ میں ان دنوں مصطفی کریم کے سانحۂ رحلت سے ذہنی طور پر ماؤف ہو رہا تھا، اس لیے عاصم بٹ کی ای میل پر دھیان ہی نہیں دے سکا اور ان کے لکھے ہوئے کو نہ سمجھ سکا اور آصف فرخی کو لکھ بیٹھا کہ کیا یہ سچ ہے۔ پھر میں خود ہی تمام اخبارات میں ان کے بارے میں تعزیتی تحریرات دیکھ کر خود کو سانحے کی تاب لانے کی تلقین کرنے لگا۔

ان سے دو ایک ملاقاتیں، ان کی شفقتیں اور ہمت افزائیاں یاد آنے لگیں۔ اگست ۱۹۹۰ء کی بات ہے، جب میں اپنے کراچی قیام کے دوران وہاں کے کئی سر بر آوردہ ادیبوں سے مل کر اپنی آنکھیں روشن اور دل کو شاد کر رہا تھا کہ فہیم اعظمی صاحب مدیر ماہ نامہ "صریر" نے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت ڈاکٹر اسلم فرخی نے کی تھی اور جس میں ممتاز احمد خان کے علاوہ افتخار اجمل شاہین اور یاور امان نے بھی شرکت کی تھی۔ مجھے مہمان خصوصی ہونے کے ناتے یہ کہا گیا تھا کہ جو بھی جس قدر بھی چاہوں سناؤں۔ میں نے دوہے، رباعیات، نظمیں اور غزلیں سنا کر موقع کا فائدہ اٹھایا تھا۔ اس سے پہلے میزبان فہیم اعظمی میرا تعارف کچھ زیادہ اہتمام سے کرا چکے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ صدر نشیں ہونے کے باوجود اسلم فرخی صاحب نے مجھے کھل کر داد دی اور محفل کے اختتام پر طعام کے دوران مجھ سے کہا کہ لکھتے رہیے۔ پرانے اساتذہ مشقِ سخن کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ میں ان کا اشارہ سمجھ گیا اور اپنی تحریروں پر زیادہ انہماک سے نظرِ ثانی کرنے لگا۔ ایک دن جامعہ

کراچی کے شعبہ اُردو میں ان سے ملاقات ہو گئی تو اپنے شعبے کے کئی اساتذہ سے انھوں نے میرا تعارف کرایا بلکہ دعوت دی کہ ایک دن میں ان کے شعبے میں طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ ایک بے تکلف بات چیت میں شرکت کروں۔ لیکن افسوس مقررہ تاریخ کو کراچی کچھ ایسے حالات کی زد میں آ گیا کہ گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ اور میں ان سے کچھ سیکھنے اور سننے سے معذور رہا۔

اسلم فرخی صاحب اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ملک کی تقسیم سے پہلے ہی باشعور ہو چکی تھی۔ ترک وطن کرنے کے کیا عوامل کار فرما تھے میں یہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انھوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کے حالات دیکھ کر ہی یہ قدم اٹھایا۔ اور نئے ملک میں ترقی کے کچھ امکانات بھی ان کو نظر آئے، انھوں نے پہلے ریڈیو پاکستان میں ملازمت کی اور اپنے تعلیمی سلسلے کو بھی آگے بڑھاتے رہے۔ سندھ کالج میں تقریباً چھ برس تک پڑھاتے رہے، جامعہ کراچی سے ایم اے کی سند حاصل کر کے اس کے اوّلین طلبہ کی فہرست میں نمایاں رہے۔ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے انہیں محمد حسین آزاد کا موضوع ملا۔ انھوں نے اپنے موضوع کو گرفت میں لے کر ایسا مبسوط مقالہ لکھا جس میں ان کے علمی تبحر اور موضوع سے ان کی وابستگی کا ان کے اساتذہ نے اعتراف کیا۔ ان کی یہ پہلی تصنیف 'محمد حسین آزاد حیات و تصنیف' کے نام سے شائع ہوئی۔ آزاد کے اسلوب کی خوبیاں اور انشائیہ نگاری کی بے ساختگی ان کی تحریروں میں بھی اپنی جلوہ گری دکھاتی ہے۔

اسلم فرخی نے شاعری بھی کی لیکن وہ اپنی شعری کاوشوں کو نمایاں نہیں کرتے تھے۔ نہ وہ رسالوں میں اپنا کلام اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔ نہ عام طور پر اپنی شاعری کا ذکر کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ اس صنف میں بھی ان کو اپنے وقت کے نمائندہ شعرا میں منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کے پاس اتنا شعری مواد تو تھا ہی کہ ایک مجموعہ بآسانی مرتب ہو جاتا۔ فہیم اعظمی کے یہاں منعقدہ جس ادبی نشست کا ذکر ہوا ہے وہاں انھوں نے میزبان کی فرمائش پر چند غزلیں سنائی تھیں جو اتفاق سے میری ڈائری میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہنگامۂ ہستی سے گذر کیوں نہیں جاتے
رستے میں کھڑے ہو گئے گھر کیوں نہیں جاتے

جس شہر میں حد اپنی عزیز دل و جاں ہے
اس شہر ملامت میں خضر کیوں نہیں جاتے
اب جبہ و دستار کی وقعت نہیں باقی
رندوں میں بہ اندازِ دگر کیوں نہیں جاتے

اور سہل ممتنع کی حامل یہ غزل بھی دیکھیے:

آگ سی لگ رہی ہے سینے میں
اب مزہ کچھ نہیں ہے جینے میں
آخری کش مکش ہے یہ شاید
موج دریا میں اور سفینے میں

یہ بحر بہت ہی رواں اور غنائی کیفیتوں کی حامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر کا کمال چھوٹی بحروں میں داد سخن دینے سے ظاہر ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ شاعر اپنے مزاج کے مطابق اس سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے اور قافیہ کو ردیف کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کر کے معنی کی تہیں دریافت کرتا ہے۔ اسی بحر کی ایک اور کامیابی:

یہ حکایت تمام کو پہنچی
زندگی اختتام کو پہنچی
پہلے دو ایک قتل ہوتے تھے
بات اب قتل عام کو پہنچی
رقص کرتی ہوئی نسیمِ سحر
صبح تیرے سلام کو پہنچی

مجھے یقین ہے کہ اگر وہ شاعری ترک نہ کرتے تو ہمارے دور کے نمایاں غزل نگاروں میں ضرور شمار ہوتے، لیکن جب وہ سنجیدہ مطالعے کی جانب پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنے لگے تو ان کو نثری جہات کی گوناگوں وسعتوں نے اپنا اسیر کر لیا۔ اس میں ان کے لائق و فائق اساتذہ کا بھی ہاتھ تھا لیکن اگر یہ ان کی اپنی افتاد طبع سے میل نہیں کھاتا، وہ اس میدان میں اپنی آمد کا اعلان

نہیں کر پاتے۔ وہ خوش نصیب تھے کہ ان کو وہ علمی و ادبی ماحول میسر آ گیا جہاں ان کے جوہر بارور ہو سکے، لیکن شعری اظہار سے ان کی نثر کو بہت فائدہ پہنچا۔ دراصل وقت گزرنے پر ان کی وابستگی نثری اسلوب سے زیادہ ہوتی چلی گئی اور انشا نگاری نے ان کی شاعری کو زیر کر لیا۔

"صاحب جی سلطان جی" کی ابتدا میں ان کی منقبت سے ان کے تعلق خاطر کا اظہار ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

بحمد اللہ نسبت ہے — نظام الدین خواجہ سے
عقیدت ہے ارادت ہے — نظام الدین خواجہ سے
نیاز عشق غایت ہے — اگر تخلیق انساں کی
یہ غایت بے نہایت ہے — نظام الدین خواجہ سے
کوئی پرسش نہیں ہو گی — کوئی بندش نہیں ہو گی
اگر صاحب سلامت ہے — نظام الدین خواجہ سے
نہ عقبیٰ کی تمنا ہے — نہ دنیا کی طمع اسلمؔ
میسر ایسی دولت ہے — نظام الدین خواجہ سے

ان اشعار کے بطون میں صاحب جی سلطان جی سے صرف ظاہری عقیدت کا بیان نہیں بلکہ اس ارادت اور روحانی اسرار کا سراغ بھی ملتا ہے جو انہیں اپنے ممدوح سے تھی۔ انھوں نے ان کے بارے میں چھ کتابیں لکھیں اور پھر بھی سیری نہیں ہو سکی۔ طویل بود حکایت دراز تر گفتم کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ نظام رنگ کے ابتدائی ورق پر ایک مختصر خطابیہ دعا سے ان کی فارسی دانی اور فارسی گوئی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان دنوں تعلیم یافتہ گھرانوں میں فارسی کا رواج عام تھا۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اے صدر نشینِ بزمِ وحدت — سلطانِ مشائخِ طریقت
اے مہر سپہر دلنوازی — اے نازشِ عالمِ مجازی
خوش بوئے تو در جہاں رسیدہ — دانم کہ بہ آسماں رسیدہ
آقا پئے ایں غلام کمتر — یک لحظہ نگاہِ مہر پرور
آقا! نگہے بہ سوئے ما کن — آقا! پئے بندگاں دعا کن

(پائین مزار، ۲۷/ مارچ ۱۹۷۸ء)

یاد نگاری یا خاکہ نویسی ایسا میدان ہے جہاں ان کے قلم کے جوہر کھلتے ہیں اور وہ ایک ایسے

تہذیبی بازیافت کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جہاں ماضی اور حال کے درمیان کچھ بھی حائل نہیں رہتا۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ واقعات اور دیدہ و شنیدہ کا☆پُر سوز و ☆پُر تاثیر بیانیہ دردمند دل کی آواز بن کر قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ اپنی اس فن کاری اور متناسب مظاہر اور عناصر کی یک جائی کے ذریعہ اسلم فرخی نے اپنی خاکہ نگاری کا حق ادا کر کے اپنے اساتذہ اور ہم عصروں اور نادر روز گارِ بزرگوں کی شخصیات کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ کاش وہ اپنی خود نوشت بھی لکھ جاتے تو وہ بھی خاصے کی چیز ہوتی کہ اس میں ان کی تشکیل و تکمیل کا قصہ ایک دور کی تواریخ کو بہ اندازِ دگر یعنی ایک مؤرخ نہیں بلکہ ایک مستند ادیب کا قلم آدابِ سخن وری کے ساتھ پیش کرتا۔ دوسرے ان کو جتنا بھی جانتے ہیں، وہ تو کوئی بھی لکھ دے گا لیکن اپنی ذہنی، نفسیاتی اور روحانی سفر کی روداد جیسا خود وہ لکھ سکتے تھے، کون لکھ سکے گا؟ شکر ہے کہ وہ ان خاکوں میں کہیں کہیں اپنا بیان بھی کر جاتے ہیں۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کی ترجمہ نگاری کے بیان میں وہ اپنے والد کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ انھیں بھائی جان کہتے تھے۔ انھوں نے انگریزی کی ایک کتاب پڑھی جو اتنی پسند آئی کہ انھوں نے اس کتاب A World We Cannot See کا اردو ترجمہ شروع کر دیا۔ غضنفر صاحب نے اس کا اردو نام تجویز کیا ''جہانِ نادیدہ'' جو ان کے والد کو بہت پسند آیا۔ جیسا کہ ''آنگن میں ستارے''، مطبوعہ جنوری ۲۰۰۱ء میں بتایا گیا ہے۔ وہ مسودہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اگر وہ ہنوز نہیں چھپی ہے تو ''اگر پدر نتواند پسر تمام کند'' کے مصداق، آصف فرخی یہ کام کر دیں۔ اتنے دنوں کے بعد کاپی رائٹ کے معاملے ختم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے براہِ راست اپنے خاندانی پس منظر اور اسلاف کے بارے میں بہت کم معلومات پیش کی ہیں۔

میں ان کی تحریروں کا گرویدہ اس لیے ہوں کہ ان کے اوراق میں مجھے ایک تہذیبی تسلسل، ایک رنگا رنگ ثقافتی اکائی نظر آتی ہے۔ میں نے ''نقوش شخصیات نمبر'' (دو جلدیں) ان دنوں پڑھا جب میں میڈیکل کالج پہلے سال کی تعطیلات گزارنے کی خاطر اپنے ایک بزرگ کا مہمان تھا۔ ان شخصیتوں کے تفصیلی کارناموں نے میرے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ میں اپنی زبان اور اس کے تحریری اور تقریری امکانات کی ہمہ گیری کا قائل ہو گیا اور خاکوں کی کوئی کتاب مجھے مل جاتی ہے تو وہ ہاتھ سے نہیں چھوٹتی کہ میں ان رفتگاں اور قائماں کی کارگزاریوں کو اپنی علمی

وراثت کا حصہ سمجھتا ہوں۔ اسلم فرخی کے ان تمام خاکوں میں ان لوگوں کا ذکر بھی برائے بیت آیا ہے، جو ان سطور میں تو ذیلی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اپنی الگ اہم پہچان رکھتے ہیں، اس واسطے مجھے ان کے ذکر سے یک گونہ قربت کا احساس ہوتا ہے جیسے مالک رام کے بارے میں لکھتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھوں نے نواب سراج الدین خان سائلؔ دہلوی اور نواب صدر یار جنگ کے جو خاکے لکھے ہیں، وہ اردو خاکوں کے مرقعے میں بڑے زندہ جان دار اور دل کش نظر آتے ہیں۔ میرے ذہن میں ان کے علم و فضل کی روشنیوں سے چراغاں ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ان میں زیرِ قلم شخص کی خوبیوں کو ہی اجاگر نہیں کرتے، ان کی بشری کم زوریوں کو بھی اپنے رواں دواں اسلوب میں اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ عیب جوئی کا گمان گزرے بغیر، مزاج کا حصہ معلوم دیتا ہے۔ نورالحسن جعفری صاحب کے متعلق انھوں نے ہنسی ہنسی میں ان کی ایک خصلت کا ذکر کیا ہے، ”در اصل جعفری صاحب ☆ پکے موحّد تھے۔ ہر بات 'لا' سے شروع کرتے، 'الا اللہ' کی منزل تک بڑی مشکل سے آتے تھے۔۔۔ پہلے جملے کا آغاز زوردار نہیں سے ہوتا تھا، کبھی کبھی نہیں، ان کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا مگر جب دباؤ پڑتا یا سمجھایا جاتا تو مان جاتے۔ اس سلسلے میں کئی واقعات سامنے آتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی اور سیّد حامد صاحب کے بارے میں۔ اتفاق سے دونوں ہی ہندوستان میں انتظامیہ کے جید اور نامور اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ ہمہ جہت ادیب بھی تھے جن سے مل کر انھیں اپنے موقف میں تبدیلی کرنی پڑی۔

وہ لکھتے ہیں کہ جعفری صاحب دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے تھے لیکن اپنے طور پر جانچ پڑتال کے بعد۔ انجمن میں جعفری صاحب کا رویہ عملے کے ساتھ عام طور پر مشفقانہ ہوتا تھا لیکن دفتری معاملات میں وہ اصول پسند اور سخت تھے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات بڑی الجھن بھی پیش آتی تھی۔ عملے کو جھاڑ بھی پلا دیتے تھے۔ لوگ برداشت کرتے تھے، کچھ جواب دینے کی جرأت بھی کرتے، مگر مرحوم ضمیر الحسن عباسی نے ان کی جھاڑ کا جواب بھی دیا اور پھر رخصت پر چلے گئے۔ چھٹی ختم ہوئی تو استعفیٰ بھیج دیا۔ مرتے مر گئے مگر پھر انجمن نہیں آئے۔ ان کے جانے کے بعد ایسا خلا پیدا ہوا جو کبھی پر نہ ہو سکا۔ جعفری صاحب کو افسوس بھی ہوا مگر تیر کمان سے نکل

چکا تھا۔ ان کی نیک خوئی اور ہمدردی کے واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ فرخی صاحب نے کہ انجمن میں ان کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ کسی کی مدد کرنے کا واقعہ بھی لکھا ہے کہ رقم بھجواتے ہوئے تاکید کردی کہ ان کا نام نہ بتائیں۔ یہ عالی ظرفی ان کو وراثت میں ملی تھی۔ جعفری صاحب کے بارے میں بات کچھ زیادہ لمبی ہو گئی لیکن باون گز کے بیان کو ایک سفینہ چاہیے۔ وہ ذی علم ہونے کے ساتھ قلم کے بھی دھنی تھے اور ان کے مضامین ''ڈان'' اور دوسرے معیاری جریدوں میں چھپتے تھے۔ مگر جتنا علم ان کے پاس تھا، اس کا بہت کم حصہ ان کی لکھائی میں سما سکا۔ وہ کڑی محنت اور پِتّا مار کر کام کرنے کے عادی تھے۔ ''قومی زبان'' اور ''اردو'' کے ہر شمارے کو وہ پوری توجہ سے پڑھتے تھے۔ ایک ایک لفظ دیکھتے، پروف ریڈنگ کی شکایت کرتے۔ کبھی کبھی مضامین کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے۔ غرض کہ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جعفری صاحب عالی ظرف، شریف النفس اور دردمند انسان تھے۔ نکمّوں اور خوشامدیوں سے چڑتے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادا جعفری کا ذکر بھی یہیں کر دیا جائے۔ وہ واحد خاتون ہیں جو ''آنگن میں ستارے'' میں جگمگا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ خاکہ نگار جب تک کسی کو قریب سے نہ دیکھے، اس پر کس طرح قلم اٹھا سکتا ہے۔ فرخی صاحب ایک خاص نہج کے آدمی تھے، ان کو کسی ادیبہ یا ہم پیشہ خاتون سے ملنے اور ان کو جاننے کا موقع کیسے ملتا۔ شکر ہے کہ انھوں نے ادا جعفری کو قریب سے دیکھا جانا، اور پھر ان کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ جن کو فرخی صاحب نے ایک سادہ اور باوقار انسان کی حیثیت سے پہچانا۔ وہ ان کے پہلے مجموعے ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کی اشاعت سے ہی ان کی کئی نظموں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ پھر ۱۹۶۷ء کی نظم 'مسجدِ اقصیٰ' نے اہلِ نظر کو چونکایا تھا۔ اس پس منظر میں ان سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔ شعبۂ اردو کے طلبہ نے انھیں مدعو کیا تھا۔ ہلکے صوفیانہ رنگ۔۔۔ چہرے پر حیا کی لہر۔۔۔ ہاتھ میں قدیم وضع کا ایک بٹوا جس میں بن دھنیے قسم کی کوئی چیز۔ یہ مشرقی سراپا بہت متاثر کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی اعزازی تقریب میں انکسار، معصومیت، بڑے دھیمے اور شائستہ لہجے میں اپنی شاعری کی بات کی اور اپنے بچوں کا بھی تذکرہ کیا اور یہ اعتراف کیا کہ میں اوّل اور آخر ایک ماں ہوں۔

اسلم فرخی کی خاکہ نگاری کی زنبیل میں بہت کچھ ہے۔ حکیم چٹکلے باز جیسے نادرِ روزگار،

معروف صحافی ضمیر نیازی، شہرت سے بے نیاز واصل عثمانی، درویشِ خدا مست محمد احمد سبز واری، رقص کرنے والا بگولہ حمید نسیم جن کے بیان کو دفتر چاہیے۔ مجھے اطمینان اس بات کا ہے کہ ان میں سے بیش تر ایسے ستارے بھی ہیں جن سے میرے ذہنی افق کو روشنی ملتی رہی ہے۔

انھوں نے بچوں کے ادب پر بھی خاصا دھیان دیا ہے اور ایک سیریز بچوں کے لیے لکھ دی ہے۔ جن میں بچوں کے "ڈپٹی نذیر احمد"، "بچوں کے مرزا غالب" اور "بچوں کے رنگا رنگ امیر خسرو" قابلِ ذکر ہیں۔

موضوع کیسا بھی ہو وہ اسے دل چسپ اور با محاورہ رواں دواں اسلوب میں اس طرح لکھ جاتے ہیں جو اسے بوجھل نہیں ہونے دیتا۔ موقع محل سے وہ فارسی اور اردو کے مناسب اشعار سے مضمون کے لطف کو دوبالا اور کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ لکھے ہوئے لفظ کی حرمت اور طلاقت کا پاس جتنا ان کے قلم کو رہا ہے، وہ ان دنوں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہوتا جا رہا ہے۔

ان کے اسلاف کا وطن فرخ آباد تھا۔ گرچہ ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی تھی لیکن ان کا تعلق دلّی سے بھی تھا کہ ان کی بیگم شاہد احمد دہلوی کی بھانجی اور ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی ہیں۔ اسی لیے ان کی ذہنی وابستگی دلّی اور اہلِ دلّی سے بھی کم نہیں ہے۔ ان کا ننھیالی خانوادہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ اپنے نام کے بجائے انھیں 'صاحب جی سلطان جی' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اس نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے اور اور "بچوں کے سلطان جی" کے عنوان سے ان کے لیے دوسری کتاب لکھی ہے۔ مجھے یاد نہیں لیکن شاید افتخار اجمل شاہین نے بتایا تھا کہ خواجہ صاحب پر انھوں نے اور کتابیں بھی لکھی ہیں جن کو دیکھنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا، شاید "دبستانِ نظام" ایسی ہی تصنیف ہے اور "بچوں کے سلطان جی بھی۔" ان کی دوسری معروف کتابیں ہیں: "فرید و فردِ فرید" جو بابا فرید شکر گنج، استاذ حضرت نظام الدین کے بارے میں ہے۔ میں اسے بار بار پڑھتا رہا ہوں اور اس کے انداز بیان اور سادہ اسلوب کی داد دیتا رہا ہوں۔ بچوں کے لیے انھوں نے اور کتابیں لکھی ہیں جن میں "بچوں کے رنگا رنگ امیر خسرو" اور چند برسوں پہلے ۲۰۱۲ء میں چھپنے والی "قلفی والی سائیکل" ہے۔ "گل دستۂ احباب" بھی ان

کی تصنیف مجھے کسی ذریعے سے ملی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے دستخط اور نیک خواہشات سے جو کتاب مجھے بھجوائی تھی، وہ تھی ''آنگن میں ستارے''، جو ایسی شخصیتوں کے بارے میں ہے جن کو وہ بھولے نہیں۔ (یہ کتاب الگ مطالعہ کی طلب گار ہے) اس سلسلے کی آخری کتاب ''موسمِ بہار جیسے لوگ'' ہے جو مجھے نصیب نہیں ہو سکی۔ لیکن ان کی تمام تصنیفات میں ایک تہذیبی اور ثقافتی شائستگی کے واضح نشانات ثبت ہیں جو ہماری وراثت کا ایک ایسا روشن باب رقم کرتے ہیں جو وقت کی گرد میں گم ہوتا جارہا ہے۔

فرخ آباد، لکھنؤ، دلّی اور کراچی میں اپنی آب و تاب دکھا کر یہ روشن چراغ جامعہ کراچی کے قبرستان میں ۱۶/ جون ۲۰۱۶ء کو ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

پروفیسر سحر انصاری☆

ڈاکٹر اسلم فرخی — چند یادیں

بلند قامت، چھریرا بدن، کلین شیو، خوش شکل، خوش لباس ڈاکٹر اسلم فرّخی ایک فعال اور زندہ شخصیت تھے۔ بعض افراد اپنی بھاگ دوڑ اور شہرت طلبی سے فعال ہونے کا تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اسلم صاحب ان میں سے نہیں تھے۔ اُنھوں نے خاموشی، متانت اور سلامت روی سے زندگی کا تمام سفر طے کیا۔ اسلم صاحب کا آبائی تعلق فرّخ آباد، فتح گڑھ سے تھا۔ اسی نسبت سے وہ خود کو فرّخی لکھتے تھے۔ ویسے ممکن ہے کہ فارسی ادبیات سے گہرے شغف کی بنا پر اُن کے ذہن میں ایران کے مشہور شاعر فرّخی سیستانی کا حوالہ بھی رہا ہو۔

ڈاکٹر اسلم فرّخی کے لیے شاید کوئی بھی اُن کی ابتدائی زندگی کے پیشِ نظر یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کس شعبے میں کام کرنے یا نام پیدا کرنے کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے مزاج میں لکھنوی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور شائستگی ہمیشہ موجود رہی۔ انھوں نے اپنی ذاتی جدوجہد سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بچوں اور بڑوں کے رسالوں کے مدیر رہے۔ پھر ریڈیو پاکستان سے اس طرح وابستہ رہے کہ شعبۂ موسیقی، شعبۂ تقاریر سے لے کر فیچر رائٹنگ، اصلاحِ تلفظ اور کتابوں پر تبصرے جیسے پروگراموں کو بھی خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے رہے۔ پھر تدریس کا شعبہ اختیار کیا اور گورنمنٹ کالج، ناظم آباد میں ان کا بہ حیثیت استاد تقرر ہوا۔ یہیں اُنھوں نے محمد حسین آزاد پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنے کے بعد جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو سے وابستگی حاصل کی۔

جامعہ کراچی میں ایک کامیاب استاد کے علاوہ اُنھوں نے گاہے گاہے جو فرائض انجام دیے اُن میں رجسٹرار کا منصب اور شعبۂ تصنیف و تالیف اور ترجمے کے ناظم کی خدمات شامل ہیں۔ س کے بعد وہ انجمن ترقیِ اردو کے مشیرِ ادبی مقرر ہوئے پھر وفاقی اردو یونی ورسٹی کے قیام

☆ خازن (اعزازی) و مشیر علمی و ادبی، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی

کے بعد جمیل الدین عالیؔ نے انھیں شعبۂ تصنیف و تالیف کا سربراہ مقرر کیا۔ دوسری طرف وہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ و طالبات کی رہ نمائی بھی کرتے رہے۔ رجحانِ طبع تصوف کی طرف ہوا تو اُس کے آداب بھی زندگی کا حصہ بن گئے۔ نقاد، شاعر، محقق اور خاکہ نگار کی حیثیت سے جانے اور مانے گئے۔

اس سارے پس منظر سے میرا مقصد اپنے اسی خیال کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ کوئی بھی یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ ڈاکٹر اسلم فرّخی فلاح شعبے کے لیے موزوں ہیں۔ وہ جس منصب پر بھی فائز رہے، انھوں نے اس پر اپنی عمدہ کارکردگی کی ایسی مثال قائم کی کہ دیکھنے والا کہہ سکتا تھا کہ وہ اسی شعبے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ایسی صلاحیت بہت کم شخصیات میں پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرّخی کے خاندان کے بیشتر افراد سے رفتہ رفتہ میرا تعارف ہوتا گیا۔ اسلم صاحب کی والدۂ محترمہ کی شفقت اور محبت کی نسبت سے میں خود کو کبھی کبھی اس گھرانے کا ایک فرد سمجھنے لگتا تھا۔ اس تعلقِ خاطر کی بنیاد انور احسن صدیقی کی دوستی اور ان کی ادبی اور نظریاتی مصروفیت کی وجہ سے پڑی۔ انور احسن صدیقی، ڈاکٹر اسلم فرّخی کے چھوٹے بھائی تھے اور انھی کی طرح ذہین اور اصول پسند انسان تھے۔ انور احسن کا تعلق بائیں بازو کی سیاست سے تھا۔ انھوں نے اردو اور فارسی میں اعزاز کے ساتھ جامعہ کراچی سے ایم اے کے امتحانات پاس کیے تھے۔ وہ شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، مترجم اور بہت اچھے منتظم بھی تھے۔ انھوں نے کالجوں اور جامعات کے طلبہ و طالبات کی نگارشات کے لیے ایک رسالہ ”لوح و قلم“ کے نام سے جاری کیا تھا جس کے سرپرست بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ اس میں طالب علموں کی تحریروں کے علاوہ خصوصاً سال ناموں میں ممتاز حسین، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، شوکت صدیقی اور سیّد سبطِ حسن جیسے سینئر ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس کی ایک سالانہ تقریب انجمن ترقیِ اردو، بابائے اردو روڈ کے احاطے میں منعقد ہوتی تھی۔ سال بھر میں جس طالبِ علم ادیب کی کم سے کم ترین تحریریں شائع ہوتی تھیں اس کو سالانہ جلسے میں ایک سند دی جاتی تھی جس پر بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دستخط ہوتے تھے۔ یہ روایت کئی سال تک قائم رہی اور اسے آخری وقت تک بابائے اردو کی سرپرستی حاصل رہی اور اس بہانے ہمیں ان کی

خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع میسر آتے رہے۔

"لوح و قلم" کے زیرِ اہتمام ایک مجلس ادب بھی قائم کردی گئی تھی جس کی اکثر نشستیں انور احسن کی قیام گاہ پر ہی ہوتی تھیں۔ ان نشستوں میں اکرم احسن صدیقی، مستحسن عباس، شفیع ادبی، امراؤ طارق، ثریا شہاب، خورشید احسن، ملکہ حسین، زاہدہ تقی، ریحانہ، حمزہ واحد، شریف کمال عثمانی، س م صولت، اشتیاق طالب، نیلوفر علیم (عباسی) وغیرہ شریک ہوتے اور ادبی تخلیقات پر تنقیدی نشست منعقد کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی فتح یاب علی خاں، سیّد سعید حسن، معراج محمد خاں، جوہر حسین، حسین نقی، نواز بٹ، شیر افضل جعفری، محمد عمر میمن بھی شرکت کرتے تھے۔ ان نشستوں سے نہ صرف ہم عمر اور ہم عصر ادیبوں اور تخلیق کاروں سے مراسم بڑھے، بلکہ سینئر اہلِ قلم اور اساتذہ سے بھی استفادے کا موقع ملا۔

اسلم فرّخی صاحب کا اپنے بھائیوں سے مشفقانہ برتاؤ رہتا تھا۔ اُن کے دوستوں پر بھی شفقت فرماتے تھے۔ کبھی کبھار تفننِ طبع کے مظاہرے بھی ہوجاتے تھے۔ تاہم ہر ملاقات میں رکھ رکھاؤ اور حدِّ ادب کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اسلم صاحب کی تدریسی اور تحقیقی مصروفیات سے تو آگاہی ہوتی رہتی تھی، لیکن سب سے زیادہ قربتیں اُس وقت ہوئیں جب میں بلوچستان یونی ورسٹی سے ۱۹۷۴ء میں کراچی آنے کے بعد شعبۂ اردو، جامعہ کراچی سے وابستہ ہوگیا۔ حسنِ اتفاق کہ میرا کمرہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے کمرے سے ملحق تھا۔ بیچ میں صرف ایک دیوار تھی جو ہمارے درمیان کبھی حائل نہیں ہوئی۔

تدریس سے فارغ ہوکر کبھی کبھار اسلم صاحب میرے کمرے میں آجاتے اور اکثر میں اُن کے کمرے میں حاضر ہوجاتا تھا۔ نہایت خوش دلی سے ادبی صورتِ حال، ادبی شخصیات، تحریکات اور ادبی سرگرمیوں پر گفتگو ہوتی رہتی۔ اسلم صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے ان کے موضوعات میں کبھی یکسانیت یا اکتاہٹ کا عنصر شامل نہیں ہوا۔ مشرق کے کلاسیکی اور جدید ادب کے علاوہ مغرب کی مختلف زبانوں کے ادب کا وہ انگریزی تراجم کے ذریعے مطالعہ کرتے تھے۔ تنقید، شاعری اور فکشن سبھی کو کھنگالے ہوئے تھے۔

اسی زمانے میں آصف فرّخی جو اس وقت انٹر سائنس کے طالبِ علم تھے، شعبے میں

آجاتے تھے اور زیادہ تر میرے پاس ہی ہوتے تھے۔ اُن میں بھی بلا کی ذہانت تھی۔ اُس وقت بھی اُن کا مطالعہ قابلِ رشک تھا۔ بعد میں انھوں نے شعبۂ طب میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی اور اب وہ ایک بہت معروف ادیب کی حیثیت سے ادبی منظر نامے پر اپنا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔

اسلم فرّخی صاحب کبھی فربہی کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ عام طور پر فربہ افراد کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عارضۂ قلب میں جلد مبتلا ہو سکتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ اسلم صاحب نے مجھے بتایا تھا، وہ صبح کو حسبِ معمول شیو بنا رہے تھے کہ سینے میں درد اُٹھا اور نا قابلِ برداشت۔ پھر وہ اسپتال میں داخل ہوئے، علاج ہوتا رہا۔ شاید اس کا سبب اُن کی سگریٹ نوشی ہو جو بعد میں انھوں نے ہمیشہ کے لیے ترک کر دی تھی۔

اسلم صاحب کا اندازِ گفتگو دل نشیں اور دل چسپ ہوتا تھا۔ خاص طور پر لیکچر دیتے وقت تو محسوس ہوتا تھا کہ وہ خطاب نہیں کر رہے ہیں، تحریر شدہ متن پڑھ رہے ہیں۔ الفاظ کا دروبست، ترتیبِ عبارت اور موضوع پر مکمل ارتکاز اُن کے خطاب کی خاص پہچان تھی۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ سیکڑوں واقعات، فارسی اور اردو کے سیکڑوں اشعار اُن کی نوکِ زباں پر رہتے تھے۔ موقع بہ موقع سنا کر اپنی بات میں وزن اور وقار پیدا کر دیتے تھے۔

زود گو تھے، بیٹھے بیٹھے اشعار موزوں کر دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں اسلم صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوں اور پروفیسر منظور حسین شور تشریف لے آئے۔ اسلم صاحب سے ان کی بے تکلفی تھی اور ادبی چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ شور صاحب جو گفتگو کرتے تھے، اسے اسلم صاحب فی الفور اشعار میں ڈھال دیتے اور شور صاحب کا تخلص استعمال کر کے کہتے، ”لیجیے صاحب آپ کی تازہ غزل آپ کی نذر ہے۔“ شور صاحب لطف اندوز ہوتے، لیکن مصنوعی احتجاج کا لہجہ بنا کر کہتے رہتے ”صاحب! یہ ہم نے کب کہی؟ یہ آپ کی شرارت ہے۔“

جامعہ کراچی میں ہر ادارے کی طرح غلط بخشی اور سیاسی ہنگامہ آرائی ہوتی تھی لیکن اسلم صاحب کبھی ان معاملات میں ملوث نہیں ہوئے۔ اُن کا اپنا موقف تھا جو اُن کی شخصیت کا حصہ تھا نہ کہ وقتی سیاست کا۔ اُسی زمانے میں سلیکشن بورڈ ہونے والا تھا اور طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ اُس وقت اسلم صاحب نے ایک شعر موزوں کیا جس نے بڑی شہرت پائی۔ شعر تھا:

نہ کرو خیالِ وی سی نہ فریبِ ڈین کھاؤ
و تعز من تشاء و تذل من تشاء

اسلم صاحب کے عام طرزِ زندگی سے بہ ظاہر اُن کے مذہبی اور متصوفانہ میلانات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن وہ باطنی طور پر ان میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کا اظہار وہ کبھی ہونے نہیں دیتے تھے۔ شروع شروع میں دو ایک دفعہ یہ ہوا کہ میں اسلم صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوں اور کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں سمجھا کہ کسی ضرورت سے گئے ہوں گے۔ ایک دن میں نے اپنے کمرے سے جھانکا تو دیکھا کہ اسلم صاحب گاؤن بچھا کر ظہر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ عام طور پر ہم نے دیکھا کہ لوگ اپنی عبادت کو جتاتے ہیں، جب کہ اسلم صاحب چھپاتے تھے۔ دکھاوے کی نماز کے لیے مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:

شیخ اللہ رے ریا کاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اسلم صاحب کے غیر معمولی حافظے کا ایک واقعہ اُن کے ہم کار ڈاکٹر عبدالسلام نے مجھے سنایا تھا۔ ایک بار انھوں نے اپنے کسی دوست کو لاہور کے پتے پر ایک پارسل ارسال کیا۔ کچھ دن گزر گئے، وہ پارسل نہیں پہنچا۔ سلام صاحب نے ڈاک خانے والوں سے شکایت کی تو انھوں نے کہا ''رسید لائیے۔'' سلام صاحب نے اسلم صاحب سے تذکرہ کیا کہ ''دیکھیے آپ بھی اُس دن میرے ساتھ تھے۔ اب رسید تو میں نے سنبھال کر نہیں رکھی تھی۔'' یہ سن کر اسلم صاحب نے کہا، ''کاغذ پر یہ ہندسے لکھیے۔'' اور جب ڈاک خانے میں دکھایا تو وہی رسید کا نمبر تھا۔ سلام صاحب کا کہنا تھا کہ ''بھئی اُنھوں نے تو زیادہ سے زیادہ اچٹتی سی نگاہ ڈالی ہوگی۔ رسید نمبر ذہن میں محفوظ ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں فوٹو گرافک میموری۔''

اسلم صاحب کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں پر مستقل لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا، میں تو اُن کی شخصیت کے کچھ پہلو اُجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ اسلم صاحب کو حضرت نظام الدین اولیا سے خاص عقیدت تھی۔ دہلی جاتے تو حسن ثانی نظامی انھیں پورا پروٹوکول دیتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی شخصیت، تعلیمات اور اثرات پر انھوں نے چھ کتابیں تحریر کیں۔ ان

میں ''نظام رنگ''اور ''دبستانِ نظام'' بہ طورِ خاص اہم ہیں۔ڈاکٹر غلام مصطفی صاحب سے وہ بیعت تھے اور اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کے اندازِ تدریس کی تعریف کرتے تھے۔

اسلم فرّخی صاحب کے یہاں ایک زمانے میں ادبی نشستیں بھی ہوتی تھیں، اُن میں بھی میں حاضر ہوتا تھا۔ بعد میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اسکالر آنے لگے تو فضا دوسری نوعیت کی ہو گئی۔ اسلم صاحب بڑی توجہ سے اپنے شاگردوں کے کام کا جائزہ لیتے اور مفید مشورے دیتے تھے۔

میرے بارے میں اُن کی توجہ کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ میری ذاتی مصروفیات، گھر کی ذمے داریوں اور صحت وغیرہ کے بارے میں استفسار کرتے اور مشوروں سے نوازتے تھے۔جب میری اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تو برابر دعائیں کیں اور خبر گیری کرتے رہے۔ ڈاکٹر آصف فرّخی تو مسلسل عیادت اور طبّی مشوروں کے لیے اسپتال آتے رہے۔

آصف فرّخی نے اسلم صاحب کے انتقال کے دن مجھے بتایا کہ میری خیریت کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ اسلم صاحب کے ذہن میں نہ معلوم کس طرح میری علالت کا خیال جاگزیں تھا کہ وہ آصف فرّخی سے آخری ایام میں پوچھتے رہے، ''سحر کا آپریشن کامیاب رہا؟ وہ لندن سے آئے نہیں ابھی؟''

ڈاکٹر اسلم فرّخی نے طویل عمر پائی اور اس کے ہر ہر لمحے کو بامقصد بسر کیا۔ اُن کی طرزِ نگارش اور علمی آثار کی نسبت سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسلم فرّخی صاحب کی رحلت سے ادب اور تہذیب کا ایک دبستان رخصت ہو گیا:

آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

ڈاکٹر فصیح الدین

ڈاکٹر اسلم فرخی —— صاحبِ دل عالم و ادیب

کراچی روشنیوں کے شہر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس شہر میں ایک اور روشنی بھی ہے جسے علم کی روشنی کہتے ہیں۔ یہ علم کی روشنی کبھی کبھار انسانوں کا روپ دھار لیتی ہے۔ ایسی ہی ایک مجسم علم کی روشنی کا نام ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب ہیں۔ روشنی کو آپ قید نہیں کر سکتے۔ یہ آزاد رہتی اور ہر حال میں پھیلتی ہے۔ ڈاکٹر فرخی صاحب بھی اس کو قید نہیں کر سکتے۔ علم کیا ہے، ایک قدم آگے آئیں اور دل کا معاملہ دیکھ لیں۔ اُن کا دل بھی روشن ہے۔ سلطان الاولیاؒ حضرت نظام الدین اولیاؒء سے ان کی گہری نسبت و عقیدت نے اُن کو ایسی روشنی عطا ہے کہ اُن کی محفل میں بیٹھنے والوں کے لیے بھی یہی کہا جا سکتا ہے، تیری محفل میں بیٹھنے والے۔۔۔ آدمی بے نظیر ہوتے ہیں۔ اتوار ۲۷/ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو بھی ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر کئی باکمال لوگ موجود تھے۔ بیگم تاج فرخی صاحبہ خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا بنا کر مہمانوں کی تواضع کرتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب اُن خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کو ایک علم دوست اور ادب نواز شریکِ حیات ملی ہے۔ ان کے بڑھاپے کا سہارا ان کی شریکِ محفل بھی رہتی ہے اور شمس العلما ڈپٹی نذیر احمدؒ کی پڑپوتی ہونے کا پورا پورا حق بھی ادا کرتی ہے۔ شمس العلما کی ایک بڑی فریم والی تصویر سامنے کی دیوار پر لگی ہے۔ ایسا نجیب الطرفین گھرانہ کہاں ملتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کی جیسی قد آور شخصیت کی قدر دانی اور خدمت گزاری شاہد احمد دہلوی پر لکھنے والی مصنفہ پروفیسر تاج فرخی صاحبہ ہی کر سکتی ہیں۔ گھر کے در و دیوار سے تہذیب ٹپکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑھاپے پر بیگم تاج فرخی نے خدمت اور وفاشعاری کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ قرآن اس لیے کہتا ہے کہ ”عورت تمھارے اور تم عورت کے لیے لباس ہو۔“ اتوار کی یہ محفل ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے دولت کدے پر اُن کی علمی سخاوت کا صدقۂ جاریہ ہے۔ یہ محفل اس خیال سے شروع کی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زیرِ نگرانی پی ایچ

☆ مدیر ”پاکستان جرنل آف کرمنالوجی“، پشاور

ڈی مکمل کرنے والے شاگرد ہر اتوار کو آستانۂ فرخی پر ضرور حاضر ہوں۔ گزشتہ تیرہ سال سے یہ محفل بلاناغہ ہر اتوار کو منعقد ہوتی رہی ہے، یہ سرخ سبز کبوتروں کی چھتری (ڈاکٹر صاحب کے شخصی خاکوں کی ایک کتاب کا نام) اور اس کے زیرِ سایہ مجھ جیسے تشنگانِ علم اور تہی دستوں کو بھی بیٹھنے کی جگہ مل جاتی ہے۔ پروفیسر ذوالفقار مصطفی صاحب نے ساری زندگی انگریزی ادب پڑھایا ہے۔ انھوں نے میری کتاب ''خامہ بہ جوش'' پڑھی تھی، کہا کہ آپ کی ''ادائے دلبری'' دل موہ لیتی ہے۔ مصطفی صاحب مشفق خواجہ مرحوم (خامہ بگوش) کے قریبی عزیز ہیں۔ کہا کہ ''آج خواجہ صاحب زندہ ہوتے تو آپ سے بہت پیار کرتے۔'' ڈاکٹر فرخی صاحب کافی ضعیف ہو چکے ہیں۔ دھیمی گفتگو اور گورا رنگ۔ چہرے پر یقین کا نور اور آنکھوں میں عشق کا سرور رکھتے ہیں۔ بڑھاپے سے چہرے کے رنگ و نور پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ میں نے ذہن پر وقفے وقفے سے زور دیا کہ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ تکلم بہت جانا پہچانا ہے، کب اور کہاں ان سے ملا ہوں مگر ان کی گفتگو کی طرف حد درجہ دھیان اور پھر جلدی جلدی سے نوٹس لینے کے عمل کی وجہ سے ذہن نے اس بار بار ابھرتے ڈوبتے سوال کا جواب فی الفور نہیں دیا۔ جیسے ہی ان کی گفتگو کی روانی بند اور چائے کا دور شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت وضعدار اور ایماندار اعلیٰ پولیس افسر اور میرے سینئر آصف پراچہ کے خدوخال میں ڈاکٹر صاحب کی شباہت آتی ہے۔ شکر ہے کسی دوسرے افسر سے نہیں ملتے ورنہ تشبیہ مثل سے تشبیہ مخالف ہوتی اور جس کا ذکر شاید پھر میں نہ کرتا کیونکہ چہ نسبتِ خاک را بہ عالم پاک۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ اچھے لوگوں کی شکل وصورت اور نشست و برخاست میں کیسی مماثلت پائی جاتی ہے۔ شاید بُرے لوگوں کے نام، کام، دام بھی اسی طرح ملتے جلتے ہوں گے۔ عرفانِ محبت اور کند ہم جنس باہم جنس پرواز بھی دراصل اسی طرح کی کوئی شے ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی محفل جہاں علم و ادب سے معمور تھی وہاں اچھی خاصی طویل بھی تھی اور جس کا احاطہ ایک کالم میں نہیں ہو سکتا اس لیے میں صرف وہی نکات بیان کروں گا جن سے شائقین فیض پائیں اور قارئین لطف اٹھائیں۔ فرمایا، ''پشاور میں جب بھی جانا ہوتا تھا تو شر نعمانی اپنی موٹر سائیکل پر باڑہ مارکیٹ تک لے جاتے تھے۔ اگرچہ ہم کچھ خریدتے نہیں تھے۔ بس دیکھتے رہتے تھے۔ کمشنر سلیم خان محسود میرے شاگرد تھے۔ کراچی میں ہمارے گھر پر رہتے تھے۔ بہت

قدر دانی کرتے اور میرے جوتے تک اٹھاتے تھے۔ میں اور احمد فراز ایک ہی دن ریڈیو پاکستان میں ملازم ہوئے۔ پشاور میں فارغ بخاری، خاطر غزنوی، محسن احسان اور رضا ہمدانی سے میری اچھی یاد اللہ تھی۔" میں نے سوال کیا، سر! ماضیٔ قریب میں پشاور اور کراچی لاہور کے مشاہیر کے درمیان اتنا گہرا اور باہمی محبت کا رشتہ تھا اور اب نفسا نفسی کا عالم ہے، کوئی ادبی رابطہ باقی نہیں رہا۔ "کیوں؟" فرمایا، "سیاسی تعصبات اور خوف نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ ان رشتوں کو بحال ہونا چاہیے۔ سیاست دانوں نے ہمارے درمیان نفرتیں پھیلائی ہیں اور اپنے مقاصد کے لیے صوبائی عصبیت کو ہوا دی ہے۔ اہلِ قلم کو اس مسموم فضا کو خوش گوار فضا سے بدل دینا چاہیے۔" فرمایا، "پشاور سے "ہم زبان"، "اردو اخبار"، "شہباز" اور "قند" سے میری بڑی میٹھی یادیں وابستہ ہیں۔ آپ لوگ کسی ایک شمارے کو جاری کر کے یہ رابطے بحال کر سکتے ہیں۔" گفتگو قومی یک جہتی کے موضوع کی طرف مڑ گئی تو فرمایا، "یہ جذبہ ۱۹۶۵ء میں صحیح طور پر سامنے آیا تھا۔ پاک بھارت جنگ کے دوران کراچی میں ادیبوں نے بھارت کی مذمت میں ایک بہت بڑا اجتماع منعقد کیا۔ جوشؔ صاحب نے صدارت کی۔ اندھیرا ہوتا تھا (بلیک آؤٹ کی وجہ سے) مگر ہم پھر بھی تھیوسوفیکل ہال تک پیدل گئے۔ جو ایم اے جناح روڈ پر واقع ہے۔ ان سترہ بیس دنوں میں کوئی چوری ہوئی، نہ مقدمہ درج ہوا، نہ دکان داروں نے قیمتیں بڑھائیں، نہ کوئی ایکسیڈنٹ ہوا۔ افسوس کہ ۱۹۷۱ء میں یہ جذبہ باقی نہ رہا۔ فرمایا، "حکومت جس چیز کا نام ہے، وہ یہاں صرف انگریز ہی کر سکے ہیں۔ یہ ریاستی یا حکومتی رٹ قائم کرنا ان کا استحقاق محسوس ہوتا ہے۔ ہم حکومت کرنے کے لائق ہی نہیں رہے۔ کمشنر کراچی لارنس (جو چارلس نیپیئر کے عزیز بھی تھے) کی بیوی نے کراچی پر ایک بڑی عالمانہ کتاب لکھی ہے۔ سکھر بیراج اس کے دور میں بنا اور افتتاح کے لیے وائسرائے آئے۔ مسز لارنس نے اس تقریب کا حال بھی لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ محافظوں کے باوجود میرے شوہر سرہانے پستول رکھ کر سوتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے دور میں حکمران بڑے بڑے عالم فاضل لوگ ہوا کرتے تھے۔ سر ولیم میور کو دیکھیں، سر اولف کیرو کو دیکھیں۔ تاریخ بھری پڑی ہے ان کے علمی کارناموں سے۔ سر ولیم میور جب یہاں سے چلے گئے تو ایڈنبرا یونی ورسٹی کے ریکٹر بنا دیے گئے۔ مولوی نذیر احمدؒ کا تحریر کردہ قرآن کا ترجمہ چھپا تو یونی

ورسٹی میں لوگوں سے کہا کہ اس شخص نے یہ اتنا بڑا کام کیا ہے کہ اس پر اس کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنی چاہیے۔ آپ ان لوگوں کا اندازِ حکمرانی پڑھیں بلکہ ہم سے تو ہندوستان نے زیادہ اچھی مثالیں قائم کی ہیں۔ یوپی میں مسلمان چودہ فی صد تھے۔ رفیع احمد قدوائی ہوم منسٹر تھے۔ اس نے یوپی پولیس میں ۸۴ فی صد تک مسلمان بھرتی کرائے۔ پھر پابندی لگی کہ مزید مسلمان بھرتی نہ ہوں تاکہ دوسرے لوگ اس کو ایشو نہ بنائیں۔ قدوائی صاحب بعد میں وزیرِ خوراک بنے اور ہندوستان میں قحط پڑا تو اس کو ختم کرنے میں بے مثال کردار ادا کیا۔"

ایک بار پھر پشاور کی ادبی محفلوں کا ذکر شروع ہوا تو فرمایا کہ "ریڈیو پاکستان سے وابستہ دو افراد بڑے لائق تھے۔ ایک شوکت اکبر جو ادیب بھی تھے، شاعر بھی اور شادی کے تیسرے دن ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئے اور دوسرے عزیز الرحمن۔ اب معلوم نہیں ان کے خاندانوں کا کیا حال ہے؟ شوکت اکبر کا جن سے بھی تعلق ہوتا تھا، ان کے بارے میں ایک فائل بنا کر رکھتے اور ان کے تمام احوال اس میں درج کرتے رہتے۔ ان کی فائلوں میں بڑی بڑی اہم شخصیات کا ذکر ہوگا۔" فرمایا، "آپ کے پشتو کے دو اصحابِ قلم اور بھی ہیں جن سے میری دوستی رہی ہے۔ ایک پروفیسر پریشان خٹک مرحوم جو بڑی عمدہ تقریر کرتے تھے اور دوسرے حمزہ شنواری مرحوم۔ حمزہ مرحوم نے مجھے ایک طویل خط بھیجا تھا کہ آپ ہمارے ہاں لواڑگی آئیں مگر میں نہ جا سکا۔ بعد میں ہماری ملاقات راولپنڈی میں ہوئی۔ مجھ سے کہا کہ آپ سے مجھے سلطان جیؒ کی خوشبو آتی ہے۔ حمزہ مرحوم بڑے فاضل آدمی تھے۔" پوچھا، "کیا آپ ان اصحاب سے واقف ہیں؟ میں نے کہا کہ "شوکت اکبر اور عزیز الرحمن سے تو میں واقف نہیں ہوں، ہاں البتہ پریشان خٹک مرحوم سے اُن کے داماد ڈاکٹر اعجاز خٹک اور اُن کے بیٹے ڈاکٹر جاوید کی وساطت سے ان کے گھر آنا جانا رہا۔ یہ وہ دن تھے جب میں پشاور یونی ورسٹی میں ایک بے سمت زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک دن میں میڈیکل کالج کے چند دوستوں کے ہمراہ حمزہ شنواری مرحوم سے انٹرویو لینے کے لیے چلا گیا۔ اس دن آنجہانی لیڈی ڈیانا خیبر پاس دیکھنے آ رہی تھی۔ غالباً ۲۶/ ستمبر ۱۹۹۱ء کی تاریخ تھی۔ سخت سیکورٹی کے باوجود ہم خیبر ایجنسی کے اندر چلے گئے۔ دوستوں نے خاصہ داروں سے کہا کہ ہم میڈیکل کالج سے آئے ہیں اور ڈاکٹر ہیں اور لیڈی ڈیانا کے میڈیکل کور کی ڈیوٹی ہمارے ذمے

ہے۔ لیڈی ڈیانا کو نہایت قریب سے دیکھا بھی۔ میڈیکل کالج کی گاڑی نے لاج رکھی اور ہر چیک پوسٹ سے پلِ صراط کی طرح گزر گئے۔ شکر ہے لیڈی ڈیانا کی اصل میڈیکل ٹیم میں نہ تھے ورنہ ڈاکٹر حسنات کی طرح آج ہم میں سے کوئی نہ کوئی اس فلم کا مرکزی کردار ہوتا جس پر آج لے دے ہو رہی ہے۔ حمزہ مرحوم کا یہ آخری انٹرویو جس کا سوال نامہ فاضلِ دیوبند تقویم الحق کاکاخیل مرحوم نے تیار کرکے دیا تھا، آج موجود نہیں ہے۔ میرے پاس صرف تصویریں رہ گئیں اور کچھ یادداشتیں۔ باقی جو کیسٹ ریکارڈ ہوئی وہ ڈاکٹر بریالے کے پاس رہ گئی جو بعد میں وہ دینے پر کسی صورت راضی نہ ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ کہانی سنی تو بہت خوش ہوئے کہ مجھے بچپن لڑکپن سے پاکیزہ نفوس کی صحبت یعنی صحبتِ اہلِ حق ملی ہوئی ہے۔ تصوف سے تعلق کے متعلق پوچھا تو میں نے مختصراً مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ کا ذکر کیا کیوں کہ زیادہ تر اُن کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ فرمایا، ''سیّد سلیمان ندویؒ سے میرے خصوصی تعلقات تھے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر سلمان (جو اب جنوبی افریقا میں ہیں) میرے شاگرد رہے ہیں۔ ان کے سارے داماد اور بیٹیوں سے ہمارے گھریلو تعلقات رہے ہیں۔ ان کے خلیفۂ اجل اور مریدِ خاص مولانا غلام محمدؒ تھے جو سیّد مرحومؒ پر ایک اتھارٹی تھے۔ یہ بڑے صوفی بزرگ تھے۔ میرا ان سے بھی بڑا خصوصی تعلق رہا ہے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے معارف اسلامی میں ایم اے کیا۔ پروفیسر لطیف اللہ (سریتِ تصوف والے) ان کے مرید تھے۔ سلطان المشائخؒ کی دعائیں نامی کتاب مرتب کی۔ میں نے بھی سلطان المشائخؒ پر بہت لکھا ہے بلکہ ''دبستانِ نظام'' نامی میری کتاب میری زندگی کا حاصل اور میرا سرمایہ ہے۔''

اس دوران میں حسنِ اتفاق ہے کہ ان کی شریکِ حیات ڈاکٹر صاحب کے مرتب کردہ تین کتابچے لے آئیں جو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بطور تحفہ دیے۔ یہ ان کے مرتب کردہ ملفوظات و فرمودات ہیں جو سلطان الاولیاؒ، بابا فرید گنج شکرؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب و منقول ہیں۔ یہاں میں نے پوچھا کہ ''تذکرۂ غوثیہ'' میں یہ دھوبن کے بیٹے کا واقعہ سچ ہے کیا؟ فرمایا، ''میں نے غور نہیں کیا ہے۔ تحقیق کرنی پڑے گی۔ ویسے ''تذکرۂ غوثیہ'' میں اور بھی بہت سے افسانے ہیں۔'' گفتگو اس سمت میں ہونے لگی تو فرمایا، ''میں نے بچپن میں بوعلی شاہ قلندرؒ اور غوث علی شاہ

قلندرؒ کے مزارات پر حاضری دی تھی۔ مولانا حالیؒ کا مزار بھی وہاں ہے۔ میں اپنے والد ماجد کے ساتھ گیا تھا۔ ایک دن وہاں مولانا حالیؒ کے بیٹے خواجہ سجاد حسین سے بھی مزار کے احاطے میں ملاقات ہوئی۔ مجھے بڑی اچھی طرح سے یاد ہے۔'' میں نے پوچھا کہ بعض لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ سرکاری ملازمت کے خطرات کے پیشِ نظر مجھے براہِ راست لکھنے کی بجائے افسانوی طرز یعنی Fictionize کر کے لکھنا چاہیے اور خاکہ نگاری میں یہ قد کاٹھ اور ناک نقشے کا نقشہ کھینچنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سنتے ہی جیسے جوش میں آ گئے۔ فرمایا،'' یہ مشورہ دینا کسی مصنف کو کہ ''یوں لکھو اور یوں نہ لکھو'' انتہائی نامعقول اور غلط ہے۔ آپ کسی کا مشورہ نہ مانیں کہ یوں لکھیں اور یوں لکھیں۔ جب جیسا دل میں آئے لکھا کریں۔'' ڈاکٹر صاحب کی محفل سے کس کا دل چاہتا ہے کہ اٹھا جائے۔ دل کہتا ہے وہ موتی بکھیرتے اور ہم چنتے رہیں وہ پھول جھڑتے اور ہم ان کی خوشبو میں رچے رہیں۔ وہ بولتے اور کانوں میں رس گھولتے رہیں۔ جگر نے سچ کہا تھا کہ آدمی آدمی سے ملتا ہے۔۔۔ دل مگر کم کسی سے ملتا ہے۔ فرمایا،'' میں نے دبستانِ نظام کا کچھ حصہ سلطان اولیاؒ کی درگاہ میں اور کچھ حصہ سلطان الانبیاؐ کی درگاہ (یعنی مدینہ) میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ حمزہؒ نے ڈاکٹر صاحب سے سچ کہا تھا کہ آپ سے سلطان جیؒ کی خوشبو آتی ہے۔ حمزہؒ کو اُن سے سلطان جیؒ کی اور مجھے اُن سے سلطانوں کے سلطانؐ کی خوشبو آئی۔ میں وہاں سے اُٹھ کے آیا اور تادیر میرے سلطنتِ دل کا سلطان سرشاری کے عالم میں رہا اور پشتو کی اس مشہور اور شیریں غزل کا یہ مصرع گنگناتا رہا، ''اے دَ زڑہ سلطانہ وایہ تہ سلطان دَ چا یئے'' (اے دل کے سلطان، بتا تو کس کا سلطان ہے؟) ایسی ہی محفلوں کے بعد روح و جاں کے مشام سے خوشبو آتی ہے۔ علم دشمن انسان کے پاس بیٹھ کر کیا خوشبو آئے گی؟ رہے نام اللہ کا۔

حسن منظر

صاف ستھرا انسان

ادیب و شاعر ڈاکٹر اسلم فرخی مرحوم نہ میرے ساتھ ہندوستان یا پاکستان میں پڑھتے تھے نہ ہم نوجوانی میں سیاسی جلسے جلوسوں میں ساتھ رہے تھے اور یہ بھی کہ تعلیم کے بعد کی ہم دونوں کی فکرِ روزگار کی راہیں ہمیشہ جدا رہیں۔ پھر بھی وہ مجھے بخوبی جانتے تھے اور میں انھیں۔ میرے انھیں بخوبی جاننے کی وجہ صرف ایک تھی، اُن کی شخصیت جو موجودہ دور کے سیاسی استعارے میں بالکل شفاف تھی۔ روسی زبان میں glasnost۔ اندر باہر ایک، ان کی شخصیت میں الجھاوے نہیں تھے۔

اسلم صاحب کے بڑے بیٹے آصف فرخی کو میں ذاتی طور سے اس زمانے سے جانتا تھا جب ان کی پہلی کتاب "آتش فشاں پر کھلے گلاب" چھپی تھی۔ بزرگ فرخی صاحب سے ذاتی واقفیت چند سال بعد ہوئی لیکن نکلے وہ مجھ سے پہلے سے واقف۔ اس لیے کہ اردو ادبی رسائل میں چھپنے والی ہر تحریر اگر اس میں کچھ بھی یاد رکھنے کے لائق ہو، انھیں یاد رہتی تھی۔ میں ان کا دو جلدوں کا محمد حسین آزاد پر ڈوکٹورل تھیسیس پڑھ چکا تھا اور اب میری یادداشت بھی اتنی گئی گزری نہیں تھی کہ خود مجھے کھٹکتی ہو۔ اس طرح ہم دونوں میں جو تعارف تھا وہ کتابوں رسالوں کی ان کی طرف سے فرستادگی اور میرے اُن سے ادبی معاملات میں سوالات کی بنیاد پر مستحکم ہوتا گیا۔ یہ باتیں سیل فون اور آئی پیڈ کے زمانے سے پیش تر کی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ایک کتاب کو پڑھنے کے اشتیاق نے مجھ سے وہ کام کرالیا جو میں سالوں سے کرنا چاہتا تھا یعنی آنجہانی پریم چند کے آخری اور ادھورے ناول "منگل سوتر" کا ہندی سے اردو ترجمہ۔ لیکن ذہن میں چھپا خوف مجھے روکتا رہا تھا کہ وہ چھپے گا کہاں اور کیسے؟ یہ کام تحقیقی نوعیت کا تھا اور اس کے حوالے میں اسکول کے زمانے سے مضامین میں پڑھتا آیا تھا۔ انھوں نے میرے استفسار پر ورق گردانی کر کے مجھے بتایا کہ جہاں تک ان کے علم میں ہے اس کتاب کا ترجمہ تاحال نہیں ہوا ہے۔

وہ ترجمہ میں نے فرفر کیا اور اسی انجمن کے رسالے "اردو" میں چھپا جہاں ہم اس وقت ۴/ جولائی ۲۰۱۶ء ان کے بارے میں تعزیت کے چند لفظ ایک دوسرے سے کہنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

میری اُن سے پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میرے گھرانے نے ۱۹۹۰ء میں دوسری ہجرت کی تھی اگر کل مجھے بحیرۂ روم کے شمالی ساحل کے کسی قصبے یا گاؤں میں جا کر رہنے کا موقع دیا جائے تو ظاہر ہے وہ ہجرت نہیں ہوگی۔ لفظ ہجرت میں فراق چھپا ہے اور اس کا مفہوم ہے افراتفری، بے سروسامانی اور بہت کچھ کھو بیٹھنا، جس پر گھر بیٹھے ہجرت کا تماشا دیکھنے والوں کی نظر نہیں پڑتی ہے۔ دسویں کے امتحان جب سر پر تھے اور میرا حوصلہ صوبے میں اوّل پوزیشن لینے کا تھا۔ اپنے مراد آباد والے گھر سے آ کر لاہور کے ایک کیمپ میں پڑ جانا میرے گھرانے کے لیے فرانس یا اٹلی کے ری ویئیرا میں جا بسنا نہیں تھا۔

اس پہلی ہجرت پر مجبور کرنے والی چیز مذہبی محبت تھی جو ایک ملک سے لوگوں کو دوسرے ملک کھینچ لے گئی یعنی غیر مذہب والوں سے اپنوں میں جہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے کو محفوظ سمجھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ایک ہم مذہب سے وابستہ ہونے کا یہ بندھن فرسودہ اور کمزور ہوتا گیا اور اس کی جگہ ایک نئی حجت نے لے لی جو لسانی تھی اور پہلی سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ثابت ہوئی۔ نیشنلزم کے میک اپ میں نفرت۔۔۔ ۳۰/ ستمبر ۱۹۸۸ء کا حیدرآباد میں قتلِ عام اسی نیشنلزم کا نتیجہ تھا اور اپنے جلو میں دوسری ہجرت لایا جو لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے میں نہیں، خود اپنے ہی ملک میں جگہ سے بے جگہ کر گئی۔

کبھی پتا نہیں چل سکا، وہ قتلِ عام حیدرآباد میں نئے بسنے والوں کے سر کون لایا تھا، نہ پتا چلانے کی کوشش کی گئی، فرشتے یہ کام کر نہیں سکتے تھے، نہ انسان جو صحیح مٹی کا بنا ہو۔ تو پھر یہ کام ایک ہی مخلوق کر سکتی تھی۔ وہ جس کی تعمیر میں نار ہے اور اُن میں سے بھی وہ جس نے پروردگار سے بڑے فخر سے کہا تھا، خلقتنی من نار۔

اسلم فرخی اس تمام عرصے میں میری طرف سے فکر مند رہے تھے۔ مرحوم احمد ندیم قاسمی کی طرح، اور جب پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ دیر تک انسان کی لائی ہوئی اس ۱۹۹۰ء کی رستاخیز

کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جس طرح کوئی شخص جو اپنے گھر کے کسی عزیز کی آخری بیماری میں عین وقت پر موجود نہیں تھا گھر لوٹ کر آنے پر ایک ایک سے بیماری کی لمحہ بہ لمحہ تفصیل سننا چاہتا ہے، مرنے والے کی آخری سانس تک، حالانکہ تب تک وہ بات پرانی ہو چکی ہوتی ہے۔ اسلم فرخی صاحب کے لیے ابھی وہ بات پرانی نہیں ہوئی تھی۔

فرخی صاحب کے ادبی سفر کا آغاز اس دور میں ہوا تھا، میرا خیال ہے، جب پبلک کو جگانے والے ادب کی باگ سجاد ظہیر، رشید جہاں، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، فیضؔ اور کرشن چندر کے پائے کے ادیبوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ بھی اس عالمی تحریک سے وابستہ نہ سہی متاثر ضرور ہوئے تھے۔ بعد میں وہ صوفیت کی طرف مائل ہوئے تھے لیکن ترقی پسند تحریک اور اس کے نمائندہ ادیبوں کو انھوں نے اپنے اندر چھپی ہوئی کسی نفرت کا نشانہ نہیں بنایا۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادبی بیر بھی ان کی فطرت میں نہیں تھا جو کتنوں ہی کا وتیرہ رہا ہے۔ یہاں بھی ان کے glasnost کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کی فکر میں دھندلاہٹ نہیں تھی گو نظریں کب کی کم زور پڑ چکی تھیں۔

سوائے ایک موقع کے جب انھوں نے ریڈیو کے کسی بڑے عہدے دار کے بارے میں مجھ سے ازرہ تفنن کہا تھا: 'صاحب وہ تو وہاں راجا اِندر بنے ہوئے تھے' اس سے زیادہ کی برائی ان کے منھ سے میں نے کسی کی نہیں سنی۔ اور یہ بھی برائی کہاں مدح سرائی تھی۔ لگتا ہے لاطینی De Mortuis nil nisi bonum ''مرے ہوئے کے لیے سوائے اس کی اچھائی کے اور کچھ مت کہو'' کو انھوں نے اپنی روح کا جزو بنا لیا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ مرزا غالبؔ کے دو شعر:

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

زعفران سے لکھ کر ان کی لکھنوی والدہ ماجدہ نے گھٹی میں پلائے تھے۔

تقریباً بیس سال پہلے جب میں ان سے ملا تھا تو صاحبِ فراش تھے۔ کچھ دیر نشت میں

بیٹھنے کے بعد جب ان کے کمرے میں لے جایا گیا تو انھوں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے ملایا۔ خیریت اور لکھنے لکھانے کا حال پوچھتے رہے۔ اٹھ کر بیٹھے نہیں۔ بہت کم زور نظر آرہے تھے۔

۳/ جون ۲۰۱۶ء کو جب اُن سے ملنے گیا تو ہمیشہ سے زیادہ لاغر نظر آئے۔ شاید ایک دو دن سے شیو نہیں کیا یا کرایا تھا۔ غافل تھے۔ یہ خیال مجھے اب آتا ہے ممکن ہے بند آنکھوں سے کہا ہو، ہوش و حواس، تاب و تواں جاچکے ہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔ اس وقت رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ چار ساڑھے چار گھنٹے بعد مجھے پتا چلا، وہ اس وقت سامان کے بعد خود جانے والے تھے لیکن منھ سے کہہ نہ سکے۔

۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۶ء تک ہر ملاقات میں اور ان گنت بار فون پر گفتگو کے بعد انھوں نے اپنا ایک ہی تاثر مجھ پر چھوڑا، یہ ہے وہ انسان جس نے تند جذبات کو کبھی اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا ہے، جو دوسرے کی معمولی سی بات بھی غور سے سنتا ہے، دھیمے انداز سے بات کرتا اور ہنستا ہنساتا ہے، جس کی شخصیت میں اونچ نیچ نہیں ہے، جو خود اور جس کا لباس ہمیشہ اُجلا نظر آتا ہے۔ تین لفظوں میں: 'صاف، ستھرا، انسان'۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

غیر مطبوعہ غزلیں

تنکے کے آسرے پہ نہ احباب سوچیے
سر سے گزر چکا ہے یہ سیلاب سوچیے
پانی کی بوند بوند کو ترسی تھی کل زمیں
ہے آج یہ زمین ہی غرقاب سوچیے
دم گھٹ نہ جائے تنگیِ حالات سے کہیں
اے ساکنانِ شہرِ تہِ آب سوچیے
چڑھتی ندی کی موج ہے اُس شوخ کی نظر
ہوگی کبھی یہ موج بھی پایاب سوچیے
دریائے زندگی میں کنارے کی آرزو
اب تو کچھ اور اے دلِ بے تاب سوچیے
غیروں کے واسطے ہے کنارے کی عافیت
میرے لیے تلاطم و گرداب سوچیے
سیلِ نشاط و خندۂ طوفاں گزر گئے
پیاسے تڑپ رہے ہیں سرِ آب سوچیے

۞

اپنے پرائے یار اور اغیار بہہ گئے
سارے ہمارے شہر کے آثار بہہ گئے
سیلِ بلا کے سامنے کیا ٹھہرتا کوئی
مضبوط تھے مگر در و دیوار بہہ گئے
تھی جن کی موجِ حسن سے آنکھوں میں روشنی
اندھیر ہے وہ یارِ طرح دار بہہ گئے
موجیں وہ قہر تھیں کہ ڈبوتی چلی گئیں
بیٹھے ہوئے تھے جو پسِ دیوار بہہ گئے
جن سے بڑھی تھی خاک نشینی کی آبرو
تیرے وہ جاں نثار وفادار بہہ گئے
ساقی یہ موجِ نغمہ و مے تو نہ تھی مگر
تھے جانِ مے کدہ وہ قدح خوار بہہ گئے
بازارِ جاں میں نقد وفا لے کے آئے تھے
وہ سارے اہلِ دل سرِ بازار بہہ گئے
ریلا اک ایسا وقت کا آیا تھا جاں گداز
روکے نہ رُک سکے مرے سب یار بہہ گئے

اگر اُن سے مکالمہ ہو گا
دلِ خانہ خراب! کیا ہو گا

سارا سنسار نیند میں ڈوبا
جاگنے والا جاگتا ہو گا

وقت کیا ایک حشر تنہائی
جیسے تیسے گزر گیا ہو گا

تیرے بالکل قریب آنے سے
فاصلہ اور بڑھ گیا ہو گا

جسے عمرِ ابد بھی کہتے ہیں
لمحہ اک انتظار کا ہو گا

واسطہ کیا اُسے اندھیرے سے
بال کھولے جو سو رہا ہو گا

شہر میں صرف رقصِ بسمل ہے
مور جنگل میں ناچتا ہو گا

اک نہ اک روز فیصلہ دل کا
سر صحرائے مدعا ہو گا

جانے والا چلا گیا آخر
اپنے دکھ کس کو دے گیا ہو گا

میرے معبود زندگی میں کبھی
کوئی لمحہ قرار کا ہو گا

ہم نہ محسوس کر سکے اسلمؔ
شہر اتنا بدل گیا ہو گا

۞

کوئے جاناں کا جو دل دادہ رہا
ہر گلی کوچے میں افتادہ رہا
خوش نصیبوں کو جگہ ملتی گئی
میں کہ استادہ تھا استادہ رہا
زندگی میں بھر گیا رنگینیاں
جس کا آنچل میرا سجادہ رہا
ہم نے ہر منزل کو پانی کردیا
زیرِ پائے شوق ہر جادہ رہا
برگ و بار آخر نکالے اُس نے بھی
ایک مدت تک جو افتادہ رہا
چاہتا بھی ہے مجھے ظالم بہت
قتل پر بھی میرے آمادہ رہا
ملنے جلنے سے تجھے کب عار تھا
اتفاقاً یہ ورق سادہ رہا
مرتبہ اک منظر حسن نظر
زادۂ دہقاں بھی شہزادہ رہا
جس سے تھی اُمید آبادی مجھے
میری بربادی پہ آمادہ رہا
پردۂ تجرید کا اعجاز تھا
جو سراپا رنگ تھا سادہ رہا
فرخیؔ کا حال کیا اس کے سوا
تیرے در سے دور استارہ رہا

خندۂ گل کا جب آوازہ ہوا
مجھ کو اپنے غم کا اندازہ ہوا

شہر اپنا لوگ اپنے جانے کیوں
ہر قدم پر زخمِ دل تازہ ہوا

ہوگئی صحرا نوردی بھی عزیز
جب سے گھر صحرا کا دروازہ ہوا

یہ نگر بھی شاد تھا آباد تھا
اس نگر میں رہ کے اندازہ ہوا

مجھ سے ہے تزئین عمر آگہی
میں نگارِ وقت کا غازہ ہوا

میں تو رخصت ہوچکا تھا بزم سے
نام کا میرے جب آوازہ ہوا

زندگی یا موت جو ہر کی نمود
کون جانے کس کو اندازہ ہوا

لوحِ دنیا پر تھا میں حرفِ غلط
آج اسلمؔ اس کا اندازہ ہوا

موسمِ گل تھا، آپ تھے، ہم تھے
لَے بہت تیز، ساز مدھم تھے
اک جزیرہ تھا سبز پانی میں
جس کے ساحل پہ خیمہ زن ہم تھے
دور ایوانِ روشنی کی لکیر
چاند روشن، ستارے مدھم تھے
جھومتے پیڑ نغمہ زن پتّے
سبز شاداب اُڑتے پرچم تھے
وقت حاضر تھا ہاتھ باندھے ہوئے
لمحے زنجیر عہد محکم تھے
گفتگو تھی کہ آئینہ خانہ
حرف محو سکوت پیہم تھے
ہمہ خلوت ہمہ پذیرائی
دو کمانوں سے فاصلے کم تھے
دل کے دریا وصال کے طوفاں
ولولے تھے کہ موجۂ یم تھے
اسلمؔ اب ہو رہا ہے یہ محسوس
اتفاق ایسے کس قدر کم تھے

نیلوفر عباسی

لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والی نادر جہاں جب فرخ آباد کے محمد احسن سے بیاہ کر سسرال پہنچیں تو ایک دھوم سی مچ گئی، محمد احسن مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے تو نادر جہاں میں بھی لکھنؤ کی تہذیب اور نزاکتوں کا سارا حسن سمایا ہوا تھا اور پھر یہ کہ اُس دُور میں کہ جب لڑکیوں کا اسکول جانا محدود تھا بلکہ کسی حد تک ممنوع تھا، اُس دور میں اُنھوں نے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔

۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو اُن کے یہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اُنھوں نے ''اسلم'' رکھا۔ محمد احسن اور نادر جہاں تعلیم یافتہ باشعور لوگ تھے۔ اسی لیے اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت بھی بہترین خطوط پر کی۔

اسلم احسن نے باپ جیسا قد و کاٹھ پایا۔ وجیہ، پروقار اور ماں جیسا خوب صورت ناک نقشہ، بڑے بیٹے اسلم کے بعد محمد احسن کے گھرانے میں اقبال جہاں، خورشید جہاں، اختر جہاں، اکرم، انور، اظہر اور ارشد کا اضافہ ہوا اور یہ گھرانہ مثالی گھرانا بن گیا۔

محمد احسن اپنے باپ دادا کی پشتینی حویلی (فتح گڑھ، یوپی) میں مقیم تھے، ان کے آبا و اجداد کا خیمہ سازی کا وسیع کاروبار تھا جس میں افغانستان کے شاہی خاندان سے انھیں بڑے بڑے آرڈرز ملتے مگر محمد احسن نے اس پیشے کو اپنانے کے بجائے ''گھڑیوں'' کے کاروبار کو ترجیح دی۔ اُنھوں نے آنے والے ''وقت'' کو پہچان لیا تھا۔ خاندان کی مخالفت کے باوجود اُنھوں نے اپنے تمام بچوں کو تعلیم دلوائی تاکہ وہ وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلیں۔

محمد احسن کے سب سے بڑے بیٹے اسلم (فرخی) ذہین، فعال، نوجوان، علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ یہ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے اُبھر رہے تھے۔ شہر میں قائم ہونے والی ادبی انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔ فتح گڑھ میں انھوں نے سب سے پہلے ''بزمِ نو آموز مصنّفین'' کی

بنیاد ڈالی۔ یہیں پر ہم ذوق اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے ان کی دوستی آرمی ایجوکیشن کور کے علیم الدین خاں سے ہوئی جو بعد میں رشتے داری میں بدل گئی اور پیار و محبت کا یہ رشتہ آخری سانسوں تک قائم رہا۔ میرے ڈیڈی علیم الدین خاں اکثر کہتے تھے، ''اسلم جیسا ذہین اور محنتی شخص روز روز نہیں پیدا ہوتا ہے۔'' اُنھوں نے اسلم فرخی کا عزم، محنت، خودداری اور ذہانت کا سفر اوّل دن سے دیکھا تھا۔

تحریکِ آزادی زوروں پر تھی، ''لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان'' کے نعرے ہر طرف گونج رہے تھے۔ اسلم فرخی، علیم الدین، ضمیر احمد اور اُن کے ساتھی شیروانیوں پر P کے بیجز لگائے رکھتے، تقریریں کرتے اور پرجوش ولولہ انگیز باتیں۔ ہر وقت اپنے وطن کے تصور کی سوچیں اور پھر ہزاروں جانوں کی قربانیوں کے بعد ''پاکستان'' بن گیا۔

بڑے ماموں پاکستان آگئے۔ یہاں کے حالات کا جائزہ لیا جو کہ اُس وقت یقیناً کوئی اتنے سازگار تو نہ تھے لیکن اپنے وطن کی محبت ہر چیز پر غالب تھی۔ وہ وطن جو اپنے پیاروں کی جانوں کا نذرانہ دے کر حاصل کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے پاکستان چوک کے علاقے، آؤٹرام روڈ کی ''مورس والا بلڈنگ'' میں ایک ایسا فلیٹ پگڑی پر لیا جس کا ہندو منیجر دھنی رام کراچی میں موجود تھا اور فلیٹ کا ماہانہ کرایہ وصول کرتا تھا۔

بڑے ماموں واپس ہندوستان گئے اور پھر تمام فیملی کو لے کر کراچی آگئے۔ کراچی جو، اب اُن کا شہر تھا، نئی اسلامی مملکت کا دارالخلافہ تھا، قائداعظم کا شہر تھا۔

محمد احسن کہ جن کا ہندوستان میں جما جمایا کاروبار تھا، اب اُنھیں صفر سے آغاز کرنا تھا۔ اُن کے سب سے بڑے بیٹے ہونے کے ناتے اسلم فرخی کو خاندان کی معاشی سپورٹ کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو جاری رکھنا تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے کے دل دادہ تھے۔ میں نے جب شعور سنبھالا، بڑے ماموں کو نہایت انہماک سے مطالعے میں غرق دیکھا، کتاب پڑھتے ہوئے اُن کے چہرے پر عجیب سی طمانیت و سکون نظر آتا، کم سن ہونے کے باوجود میں اُس خوشی اور سرشاری کو اُن کے وجود میں محسوس کر سکتی تھی جس کی جھلک اُن کے چہرے کو پرنور بنا رہی ہوتی۔ ایسا نور جو کہ صرف ایسے چہروں پر نظر آتا ہے جن کے دل مطمئن ہوتے ہیں جن کے وجود حسد، جلن اور خود غرضی

سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ آگے اور آگے بڑھتے ہیں، دیانت داری سے۔

پانچ بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے بڑے ہونے کے ناتے وہ ہمیشہ عزت و احترام کے لائق تھے، اس کے حق دار وہ اپنے رویوں کی وجہ سے بھی تھے۔ اُن سے چھوٹے بھائی بہن آپس میں ہنسی مذاق کر رہے ہوتے مگر ''بھیا'' کے سامنے محتاط ہو جاتے مگر وہ نہ صرف زیرِ لب مسکراتے رہتے بلکہ کبھی کبھی اُس کا حصہ بھی بن جاتے۔ اقبال جہاں، میری ممی جو کہ اُن کے فوراً بعد کی بہن تھیں، اُن سے بہت زیادہ ہنسی مذاق دوستی تھی۔ دونوں کے مشاغل بھی ملتے جلتے تھے۔ کوئی اچھا شعر، اچھی کتاب ملتی تو دونوں گھنٹوں اُس پر گفتگو کرتے اور گفتگو بھی ایسی کہ سنا کرے کوئی۔ اُن کو سیکڑوں اشعار اور نظمیں زبانی یاد تھیں جن کا استعمال بر محل کرتے۔ وہ خود بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ میں نے اُن کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں کئی نوٹ بکس میں اُن کی نظمیں اور غزلیں پڑھیں۔ ''ماموں آپ یہ کلام چھپواتے کیوں نہیں؟'' ایک بار میں نے پوچھا تو بولے، ''چھپوا لیں گے کبھی۔'' وہ بڑی بڑی باتوں کے ایسے چھوٹے چھوٹے جواب دیتے تھے۔ اُنھوں نے شاعری کو اپنی شناخت نہیں بنایا۔

بڑے ماموں نے پاکستان چوک کے علاقے کا انتخاب اس لیے کیا کہ ایک تو ''پاکستان'' اس کا حصہ تھا، دوسرے اُس وقت کے تمام مشہور اور بڑے کالج اس کے اطراف میں تھے، ڈی جے سائنس کالج، ایس ایم لا، ایس ایم آرٹس کالج، ڈاؤ میڈیکل کالج، سندھ مدرسۃ الاسلام، این ای ڈی انجینئرنگ، کامرس کالج اور پھر کتابوں سے بھری برٹش کونسل لائبریری۔

چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم اُن کے لیے اوّلین سوچ تھی۔ بڑے ماموں نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ریڈیو پاکستان ایک ایسا ادارہ تھا کہ جس کی مثال آج بھی نہیں ملتی۔ جہاں ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں تھیں کہ جو علم و دانش کا منبع تھیں جن کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے خوش نصیب گردانے جاتے۔ بڑے ماموں جو کہ خود لکھنے پڑھنے کے دل دادہ تھے، اُنھیں یہ فضا خوب راس آئی۔ شاہد احمد دہلوی صاحب بھی ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک تھے۔ وہیں اسلم فرخی کی ملاقات ان سے ہوئی اور شاہد صاحب اس نوجوان کی قابلیت اور طور طریقوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی بھتیجی تاج بیگم کے لیے ان

کا انتخاب کرلیا۔ دونوں خاندانوں کی رضامندی سے تاج بیگم ہماری ممانی بن گئیں۔ یہ شاہد احمد دہلوی کے بھائی سراج دہلوی کی صاحب زادی ہیں۔ نہایت سلجھی ہوئی، معاملہ فہم، تعلیم یافتہ۔ ان کا تعلق ڈپٹی نذیر احمد کے خانوادے سے ہے۔ زندگی کے سفر میں آگے بڑھنے میں وہ ہمیشہ اُن کے شانہ بہ شانہ رہیں، (خود بھی پرنسپل رہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دو بہت ہی پیارے بیٹوں کی نعمت سے نوازا؛ آصف اور طارق۔

ریڈیو پاکستان کے بعد اسلم فرخی نے اپنی تمام تر توجہ درس و تدریس کی جانب کردی۔ ''محمد حسین آزاد'' پر ریسرچ کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

گورنمنٹ کالج اور کراچی یونی ورسٹی سے ہزاروں طالبِ علم ڈاکٹر اسلم فرخی کے علم و دانش سے فیض یاب ہو کر نکلے۔ دنیا کے ہر اُس خطے میں جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے بستے ہیں، وہاں ادب و احترام سے ان کا نام لینے والے موجود ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت لیکچرار اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا اور پھر آگے بڑھتے ہوئے چیئرمین اردو ڈیپارٹمنٹ ہوئے۔ شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ رہے۔ کراچی یونی ورسٹی کے رجسٹرار ہو کر ریٹائر ہوئے۔ انجمن ترقیِ اردو میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر صاحب روایتی ''پروفیسروں'' جیسے نہیں تھے کہ جن کے متعلق ایک عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ صرف کتابوں کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور خاندانی معاملات اور دنیاوی مسائل سے کوئی غرض نہیں رہتی۔ وہ ہر چیز کو ساتھ لے کر چلتے تھے، ایک توازن کے ساتھ یہی وجہ ہے کہ اُن کا گھر ہمیشہ پرسکون اور فیملی مطمئن نظر آتی۔ امتحانوں کے زمانے میں، میں اسٹاف ٹاؤن میں ماموں کے گھر رُکتی تو دیکھتی ماموں ممانی ماشاء اللہ تہجد نہیں چھوڑتے اور پھر فجر کے وقت تازہ دم۔ اپنے بچوں کی ماموں ممانی نے بہترین تربیت کی۔ آصف ماشاء اللہ میڈیسن کے ڈاکٹر ہونے کے باوجود ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ کئی کتب کے مصنف، ایوارڈ یافتہ۔ طارق قابل انجینئر، اپنی فیلڈ میں ماہر، ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے دیکھا۔ وہ خوش نصیب تھے کہ ایک مکمل، پرسکون، پروقار زندگی گزاری، وہ selfmade شخصیت تھے جس نے کبھی سفارش یا خوشامد کی بیساکھیاں استعمال نہیں کیں۔

اتوار ۲۲؍ مئی مغرب کے بعد میں بڑے ماموں سے ملنے اُن کے گھر گئی تو وہ ماشاء اللہ صاف ستھرے سفید لباس میں ملبوس اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اُن سے مل کر دعائیں لے کر جب میں اُٹھنے لگی واپسی کے لیے تو بولے، ''دیکھو نیلو ایسے مت واپس نیو یارک چلی جانا، ابھی تک ایک وقت بھی ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھایا تم نے۔'' ''نہیں نہیں ماموں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا مگر ایسا ہو گیا۔ وہ خود چلے گئے، ایسے جہاں، جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی۔ پندرہ جون ۲۰۱۶ء کو میرے بڑے ماموں ڈاکٹر اسلم فرخی خالقِ حقیقی سے جا ملے:

اک عرض کروں کہ کیا ہوا ہے
اک عہد کا خاتمہ ہوا ہے

جب ایک عام شخص اس جہاں سے جاتا ہے تو وہ صدمہ اُس کے عزیزوں، رشتے داروں اور پیاروں کے لیے ہوتا ہے مگر ایک دانش ور اور عالم کی موت ایک عہد، ایک دور کا خاتمہ ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر اسلم فرخی تو شاعر تھے، نثر نگار تھے، محقق تھے جنھوں نے ہزاروں الفاظ اپنے حصار میں لے لیے تھے اور بہ قول پروین شاکر:

مر بھی جاؤں تو ہے کیا لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

ڈاکٹر اسلم فرخی

مت سہل ہمیں جانو☆

اگرچہ آج کا معاشرہ مطالعے کی عادت سے رفتہ رفتہ محروم ہوتا جارہا ہے اور پڑھے لکھے لوگ بھی کتابوں کے تبادلے اور پڑھی ہوئی کتابوں پر اظہارِ رائے سے گریز کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی وجہ سے مطالعے کی ہمہ گیر عظمت قائم ہے۔ ضمیر نیازی صاحب کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے، اکثر کرم فرماتے ہیں اور ایک سے ایک اچھی کتاب مطالعے کے لیے بھجواتے رہتے ہیں۔ چنانچہ انور ظہیر خاں کے خاکوں کا مجموعہ بھی اس تاکید کے ساتھ مجھے بھجوایا کہ آپ کو اس پر کچھ لکھنا ہے۔

ضمیر نیازی صاحب کو خاکوں کا یہ مجموعہ اس لیے پسند ہے کہ یہ جرأت مندانہ اظہار، صاف گوئی، بے باکی اور حقائق نگاری کا مرقع ہے۔ یہ عناصر خود ان کے مزاج اور طبیعت کا خاصا ہیں اور انھیں یہ عناصر جہاں کہیں نظر آتے ہیں، پسند خاطر ہوتے ہیں۔ ایک آدھ دفعہ ان سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال بھی ہوا کہ خاکہ نگاری کا جو عمومی رنگ ڈھنگ ہے، یہ آہنگ اس میں کیوں نہیں ملتا اور ہم تبادلۂ خیال کے بعد صحیح یا غلط اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم سچ بولنے اور سچ سننے سے گھبراتے ہیں اور ہمارے اس خوف نے ایک طاقت ور معاشرتی رجحان کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

انور ظہیر خاں خوف کے اس معاشرتی رجحان کا شکار نہیں۔ وہ ذہنی اعتبار سے ایک مضبوط آدمی ہیں اور سچ بولتے ہیں۔ سچ بولنے میں انھیں کوئی باک نہیں، نہ کوئی خوف ہے، نہ وہ اپنی خاکہ نگاری میں مصلحتوں کے اسیر نظر آتے ہیں۔ ان کے خاکے حقیقت پسندانہ انداز سے مرتب کیے گئے ہیں۔ جو کچھ دیکھا، جو محسوس کیا، جو سمجھ میں آیا، جو تاثر قائم ہوا، اُسے پوری سچائی کے ساتھ قلم بند کردیا۔ یہ نہیں سوچا کہ ممدوح کی شخصیت کو اس سے فائدہ پہنچے گا یا نقصان۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات بھی کہہ جاسکتی ہے کہ انور ظہیر خاں نے اپنے کسی ممدوح کی شخصیت اجاگر کرنے کے لیے نوک پلک سنوارنے یا مشاطہ گری کا فریضہ انجام نہیں دیا، نہ قاری کے جذبات،

ہمدردی اور رحم کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اچھی بات کو سراہا ہے، خامی کی نشان دہی کی ہے لیکن نہ ستائش کا کام کیا نہ عیب جوئی میں مبتلا ہوئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں جذباتِ محبت کی رو میں بہ کر اپنے ہی معیار سے ہٹ گئے ہیں۔ سردار جعفری کے خاکے میں ان کا بیان اسی محبت اور عقیدت کا اظہار ہے لیکن اس کے نمونے بہت کم ہیں۔

انور ظہیر خاں نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں، وہ سب شخصیت اور کارناموں کے اعتبار سے بڑے اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ آج کا قاری ان میں سے ہر ایک سے بہ خوبی واقف ہے لیکن انور ظہیر خاں نے ان کی شخصیت کو جس طرح پیش کیا ہے، اس سے متعدد گوشے سامنے آئے ہیں۔ ظ انصاری کا جلال (۱۹۴۷ء میں میری ان سے رسم و راہ تھی اور بمبئی میں ہم دونوں تقریباً روز ہی ملا کرتے تھے) لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی ان کی شخصیت کی اُس کڑواہٹ کو محسوس نہیں کیا جس کی نشان دہی انور ظہیر خاں نے کی ہے۔ ضمیر نیازی صاحب کے حسنِ توسط سے مجھے ظ انصاری کے رقم کردہ اخباری اداریوں کے ایک مجموعے کے مطالعے کا موقع بھی ملا ہے۔ اُس مجموعے میں بھی ظ انصاری کے مزاج کی تیزی اور ان کی تحریر کی کاٹ بہت نمایاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تلخی اور کاٹ آہستہ آہستہ ان کی شخصیت کا جزو بنی ہے۔ انور ظہیر خاں نے اسے بڑی خوبی اور سچائی سے اجاگر کیا ہے۔ ظ انصاری کے مزاج اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس سچائی سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔

سردار جعفری، اختر الایمان، باقر مہدی، حسن نعیم، عزیز قیسی اور ندا فاضلی سب ہمارے جانے پہچانے ادیب اور شاعر ہیں، اردو کی ادبی تاریخ کا جزو ہیں۔ روایتوں اور درایتوں کے فن کار ہیں اور صرف تاریخ کا جزو نہیں، اپنے کارناموں اور اپنی شخصیت کی وجہ سے ہمیں عزیز بھی ہیں۔ انور ظہیر خاں کی بدولت ہم خود کو ان کے بہت قریب محسوس کرتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے ان سب کو پوری سچائی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، پورے انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سچائی کو نمایاں کیا ہے۔ مبالغے کا غازہ نہیں چڑھایا اور ہیرو پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس وجہ سے ان شخصیتوں کی طرح انور ظہیر خاں نے بھی قاری کے لیے قابلِ قدر حیثیت اختیار کر لی ہے۔

انور ظہیر خاں کو موسم اور مقامات سے بڑا لگاؤ ہے۔ ان کے اکثر خاکوں میں موسم کی رنگینی اور دل فریبی سے شخصیت کے خدو خال کچھ زیادہ دل کش محسوس ہوتے ہیں۔ وہ موسم کا ذکر بڑے شاعرانہ انداز سے کرتے ہیں۔ میں نے ان کے ہر خاکے میں موسم کی خوب صورتی اور رعنائی کا تذکرہ پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ صرف موسموں کے جمالیاتی رچاؤ اور فضا کی رعنائی سے ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ شخصیتوں کے جمالیاتی رُخ سے بھی پوری طرح لطف اندز ہوتے ہیں اور قاری کو بھی اس لطف میں شریک کر لیتے ہیں۔ ناگفتنی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ یہ ان کی سچائی کا تقاضا بھی ہے اور قاری کی ضرورت بھی، تاہم ان باتوں کو وہ اتنے سہل اور بے تکلف پیرائے میں بیان کر دیتے ہیں کہ ان کے ناگفتہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ ذاتی طور پر مجھے ان کا یہ انداز بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

انور ظہیر خاں نے اپنے خاکوں کو ''نفسیاتی رنگ'' کا حامل قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنی خاکہ نگاری کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ خاکے کے چوکھٹے میں شخصیت اپنے وجود اور سائے کے ساتھ آئینہ ہو جائے۔'' جہاں تک نفسیاتی رنگ و آہنگ کا تعلق ہے تو یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انور ظہیر خاں نے اپنے ممدوحین کو صرف نفسیاتی اعتبار سے نہیں دیکھا، پوری انسانی زندگی اور اس کے فکر و عمل کے دائرے میں جانچا اور پرکھا ہے، ان کا کوئی خاکہ یک رُخا نہیں اور شخصیت کے سارے پہلوؤں پر محیط ہے۔ ادبی قامت کے بیان میں زندگی کے عام پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ وجود اور وجود کا سایہ دونوں ساتھ ساتھ پھیلتے اور بڑھتے محسوس ہوتے ہیں۔ انور ظہیر خاں کے خاکوں کی طرح خاکہ نگاری کے بارے میں ان خیالات بھی حقیقت پسندانہ اور سچائی پر مبنی ہیں۔

اور آخر میں یہ اہم بات کہ انور ظہیر خاں کا نثری اسلوب ان کی خاکہ نگاری اور ان کے ممدوحین کی شخصیتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس میں ڈرامائی استعجاب بھی ہے، فکر بھی ہے، شاعرانہ رعنائی بھی ہے، کہیں کہیں تلخی اور زہر چکانی بھی ہے اور زندگی کی تیز رفتاری، پیچیدگی اور ہمہ گیری کا احساس بھی ہے۔ انور ظہیر خاں کی نثر بڑی سہل اور خوب صورت ہے مگر موقع محل کے اعتبار سے کبھی کبھی کچھ تیز بھی ہو جاتی ہے۔ انھیں گفتگو، ملاقات، تاثرات اور

خیالات کو رقم کرنے کے رنگ ڈھنگ پر محرمانہ قدرت حاصل ہے۔

"مت سہل ہمیں جانو" سات رنگوں کی دھنک ہے۔ ہر رنگ دیدہ زیب، گہرا اور پر کشش ہے۔ نیازی صاحب جیسے بالغ نظر ادب شناس نے اس مجموعے کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے تو غالباً یہی سوچ کہ ہمارا قاری بھی ان کی طرح رنگوں کی اس قوسِ قزح سے لطف اندوز ہو۔ انفرادی لذت اندوزی کے اجتماعی استفادے میں تبدیل ہونے کا عمل ہمیشہ خوش گوار اور باعثِ برکت ہوتا ہے تو میں ایسی اچھی کتاب کی اشاعت کا اہتمام کرنے پر انھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور انور ظہیر خاں کے فن کا تو میں قائل ہی نہیں مدح خواں بھی ہوں۔ میری رائے میں سچائی کی مدح کرنا بھی سچائی کو پھیلانے کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

مشاعرے کی روایت —— ایک جائزہ

یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ اردو شاعری نے مشاعرے کی روایت اور مشاعرے کی روایت نے اردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ مشاعرے کی روایت ایک تہذیبی قوت، علمی موشگافیوں اور تخلیقی جودت کے بھرپور اظہار کی وجہ سے ہماری ثقافتی تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں بھی مشاعرے ہوتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان میں شریک بھی ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے اداروں میں موقعے موقعے سے مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں کراچی میں برماشیل کے سالانہ مشاعروں کو ادبی سطح پر بڑی اہمیت حاصل تھی کیوں کہ یہ اردو شاعری کے کسی نامور اُستاد کے حوالے سے منعقد ہوتے تھے۔ برماشیل پر کیا منحصر، کراچی میں مشاعروں کی روایت کو خود روزنامہ ''ڈان'' نے بڑی دھوم دھام سے فروغ دیا ہے۔ ''ڈان'' کے سالانہ مشاعروں کو جنھیں تفننِ طبع کے طور پر ''عظیم الڈان'' مشاعرے کہا جاتا تھا، ایک قابلِ قدر ادبی تقریب کی حیثیت حاصل تھی۔ مجھے یاد ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد جگرؔ صاحب پہلے پہل کراچی ''ڈان'' ہی کے مشاعرے میں شرکت کرنے آئے تھے:

مشاعروں کی شعری، ادبی اور علمی اہمیت کے حوالے ڈھائی تین سو برس کی شعری تاریخ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ دلّی میں ایک شاعر تھے حضرت خواجہ میر دردؔ، وہ نقش بندی سلسلے کے بڑے بزرگ تھے۔ اُن کے یہاں ہر مہینے مشاعرہ ہوتا تھا جسے زبانِ اردو کے پرانے نام ''ریختہ'' کی مناسبت سے ''مراختہ'' کہا جاتا تھا۔ خواجہ صاحبؒ نے میر تقی میرؔ سے کہا، یہ مراختہ تم اپنے یہاں کیا کرو۔ مطلب یہ تھا کہ مشاعرہ میرؔ کے یہاں ہوگا تو اُنھیں شاعروں میں اعتبار بھی حاصل ہوگا، لوگوں سے شناسائی بھی بڑھے گی اور ادبی حیثیت بھی مستحکم ہوگی۔ کیا دل نواز طریقے تھے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کے۔ پھر اس دلّی میں ایک مشاعرے میں انشاؔ اور عظیمؔ کا وہ مشہور معرکہ ہوا جس نے اردو شاعری کو ایک ضرب المثل مصرع ''وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے''

عطا کیا۔ یہ مقابلے کا پہلو تھا۔ شعرا ایک ایک قافیے کے لے جانیں لڑا دیتے تھے۔ ہر ہر پہلو سے غور کرتے تھے۔ کوئی قافیہ رہ نہ جائے۔ شعر میں کوئی عیب نہ ہو، ورنہ سرِ مشاعرہ اعتراض ہو گا۔ استاد اپنے شاگردوں کو ساتھ لیے مقابلے پر کمربستہ مشاعروں میں اپنے اپنے مقام پر بیٹھے پہلے اپنے شاگردوں اور دوسرے اساتذہ کے شاگردوں کا کلام دشمن کے کانوں سے سنتے اور جب شمع اساتذۂ فن کے سامنے آتی تو سب سنبھل کر بیٹھ جاتے اور اعتراض کے پہلو تلاش کرتے رہتے۔ مشاعرے ہی شاعر اور شاعری کے کھوٹے کھرے کی آزمائش ہوتے تھے۔

مقابلے ہوتے تو ایسے کہ شاہ نصیرؔ نے سنگ لاخ زمین میں غزل لکھی، "قفس کی تیلیاں، نفس کی تیلیاں" اور ترنگ میں آکر یہ کہہ دیا کہ سال بھر اس زمین میں مشاعرے ہوں۔ سال بھر اسی زمین میں مشاعرے ہوتے رہے اور مکھیاں اُڑتی رہیں۔ غالبؔ کی مشکل پسندی پر طنز کرنے کے لیے اُن کے ایک خوش گو معاصر حکیم آغاجان عیشؔ نے مشاعرے کی طرحی غزل میں یہ شعر پڑھے تھے:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزاؔ سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ مشاعرے کی تنقیدی روایت تھی اور اس روایت کی پاس داری میں غالبؔ نے ان اشعار کا جواب بھی لکھا۔

شروع شروع میں صرف دلّی ہی اردو شاعری کا مرکز تھی۔ لکھنؤ تہذیب اور حکومت کے ایک مرکز کی حیثیت سے اُبھرا تو شاعری اور مشاعرے دونوں کی روایت نے وہاں بھی فروغ پایا۔ یہ روایت ادبی، علمی اور تہذیبی زندگی کا جزو بن گئی۔ محمد حسین آزادؔ کے بقول میر تقی میرؔ لکھنؤ گئے، سرائے میں ٹھہرے۔ معلوم ہوا کہ قریب ہی میں مشاعرہ ہے۔ سن کر رہ نہ سکے، پہنچ گئے اور پھر آزادؔ نے میرؔ اور اُن کی وضع قطع، حلیے اور لباس کی وہ زندہ تصویر پیش کی ہے جو اردو شاعری کے تاریخی مرقعے میں لازوال ہو گئی ہے۔ میرؔ کے اندازِ قدیمانہ کو دیکھ کر اہلِ مشاعرہ میں جو چہ میگوئیاں ہوئیں، اُس کے جواب میں میرؔ صاحب نے طرحی غزل میں یہ اشعار پڑھے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

اور سارے شہر کو معلوم ہو گیا کہ میرؔ صاحب شہر میں وارد ہوئے ہیں۔

لکھنؤ میں مشاعروں کی ادبی افادیت، باریک بینی اور مسابقت کے جذبے کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ ایک مشاعرے میں دیر سے پہنچے۔ شمع اُن کے استاد مصحفیؔ کے سامنے تھی۔ ناسخؔ نے حریفانہ انداز میں کہا، خواجہ صاحب آپ دیر میں تشریف لائے۔ اس بچے نے ایسا مطلع پڑھا ہے کہ لاجواب ہے۔ یہ کہہ کر شمع مصحفیؔ کے سامنے سے اُٹھا کر اُس لڑکے کے سامنے رکھ دی اور کہا، ہاں میاں پڑھو۔ لڑکے نے پڑھا:

جس کم سخن سے میں کروں تقریر بول اُٹھے
مجھ میں کمال یہ ہے کہ تصویر بول اُٹھے

آتشؔ استاد کے سامنے سے اس طرح شمع اٹھائے جانے پر آگ ہو گئے۔ کہنے لگے، واہ شیخ صاحب! ایسے مطلعے پر دادِ تحسین جس میں نقص اتنا واضح ہے۔ پھر کہا، یہاں تصویر کم سخن نہیں ہوتی۔ اس طرح پڑھو:

جس بے زباں سے میں کروں تقریر بول اُٹھے
مجھ میں کمال یہ ہے کہ تصویر بول اُٹھے

یہ حریف کو ترکی بہ ترکی جواب اور مشاعرے کے تنقیدی مرکز سے تنقیدِ شعر کا موثر اظہار تھا۔ ایسے اظہار اکثر و بیشتر ہوتے رہتے تھے۔ آتشؔ نے مشاعرے میں مطلع پڑھا:

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نورجہاں بیگم ہے

معترض نے کہا، خواجہ صاحب بیگم ترکی زبان کا لفظ ہے اور بیگم نہیں بیگُم ہے (انگریزی میں ترکی سے آیا ہے اس لیے begum لکھا جاتا ہے)۔ آتشؔ نے کہا، ہاں جب ہم ترکی جائیں گے تو بیگُم ہی کہیں گے مگر یہاں بیگم ہی صحیح ہے۔ یہ اس لسانی اصول کی طرف اشارہ ہے کہ جو لفظ کسی زبان میں کسی دوسری زبان سے آگیا، وہ لفظ کو قبول کرنے والی زبان کے محاورے کے مطابق استعمال ہوگا۔ حریفانہ چپقلش اور نوک جھونک میں علمی اور ادبی پہلو ہمیشہ مد نظر رہتا تھا اور حریفانہ انداز کے حوالے سے وہ مشاعرہ جس میں آتش نے اپنی مشہور غزل ''سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا'' پڑھی تھی۔ مشاعروں کی تاریخ میں یادگار حیثیت کا حامل ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد مشاعروں کی روایت دلّی اور لکھنؤ سے نکل کر رام پور، حیدرآباد، عظیم آباد اور لاہور میں پھولی پھلی۔ امیرؔ و داغؔ کی وجہ سے رام پور کے مشاعروں میں بڑا زور پیدا ہو گیا تھا۔ مشاعرے میں کسی شاعر کا شعر سن کر اُسے تخلیقی انداز سے اپنے رنگ میں ڈھال لینے کی روایت یہاں بہت کامیاب رہی۔ ایک مشاعرے میں داغؔ نے مطلع پڑھا:

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا، ایک کا حال اچھا ہے

شمع جلالؔ لکھنوی کے سامنے آئی تو انھوں نے غزل میں یہ شعر پڑھا:

دل مرا، آنکھ تری، دونوں ہی بیدار مگر
ایک کا حال برا، ایک کا حال اچھا ہے

داغؔ کے یہاں کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جلالؔ نے ثبوت فراہم کر دیا۔

اُنیسویں صدی کے آخر ہوتے ہوتے تک تعلیم کے فروغ، تہذیبی پاس داری، ذرائع آمد و رفت کی سہولت اور لسانی قربت کی وجہ سے مشاعروں کی روایت برصغیر کے گوشے گوشے میں عام ہو گئی۔ نئے شعری اور ادبی مرکز وجود میں آئے اور مشاعرے کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ سیال کوٹ کے ایک نوجوان طالب علم شاعر نے جب مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی اور یہ شعر سنایا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو صرف اُس کی تحسین نہیں ہوئی بلکہ ایک نئے شعری مرکز اور مشاعرے کی روایت کی عالم گیری کا احساس بھی عام ہو گیا۔

بیسویں صدی میں کچھ عرصے تک طرحی مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا۔ طرحی مشاعرے مقابلے اور مسابقت کے جذبے کو فروغ دیتے ہیں مگر پھر مشاعروں کی کثرت اور مقامی کے بجائے ملکی مشاعروں کے انعقاد نے طرح کی پابندی کو ختم کر دیا۔ وہ جو مقابلے کی روح تھی، اصلاحِ ادب کا جذبہ تھا، وہ ختم ہو گیا۔ شعرا مشاعروں میں اپنا بہترین اور مخصوص کلام پیش کرنے لگے۔ اس کا ایک نتیجہ جو خوش گوار نہیں تھا، یہ بھی نکلا کہ شعرا نے ہر پھر کر ہی مشاعرے میں اپنی خاص غزلیں سنانا شروع کر دیں اور اس طرح تازہ بہ تازہ نو بہ نو والی کیفیت رخصت ہو گئی۔ ایک اور نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ شعرا نے تحت اللفظ کے بجائے ترنم سے پڑھنا شروع کر دیا جو عام سننے والوں کے لیے بڑا خوش آئند تھا۔ اردو شاعری میں زبان اور لہجے کی بڑی اہمیت ہے۔ تحت اللفظ پڑھنے والا جب زبان اور لہجے کی مناسبت کو مد نظر رکھ کر شعر پڑھتا تھا تو معنویت کی تہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ترنم میں معنویت کی تہیں نہیں کھلتیں۔ ترنم شعر کی معنویت پر غالب آجاتا ہے۔ بہر حال ترنم نے مشاعروں کو عوامی سطح کی دل چسپی اور ہر دل عزیزی کا حامل بنا دیا۔ پھر یہ ہوا کہ مشاعرے میں غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی پڑھی جانے لگیں۔ مشاعرہ بڑا ملنسار ہے، اُس نے نظم کو بھی گلے لگایا اور آزاد نظم کو بھی اپنی محفل میں جگہ دی۔ کسی صنف پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ اس وجہ سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔

آج کے دور میں فاصلے گھٹ گئے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے ہیں۔ اردو زبان ملکوں ملکوں پھیل گئی ہے۔ اس پھیلاؤ میں مشاعرے بھی برابر کے شریک ہیں۔ متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، انگلستان، ناروے، سویڈن، کناڈا، امریکا، آسٹریلیا، جنوبی افریقا ہر ملک میں مشاعرے ہوتے ہیں، دھوم دھام سے ہوتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے شاعر بھی ان میں شریک ہوتے ہیں اور تارکینِ وطن سے تعلق رکھنے والے شاعر بھی ہوتے ہیں۔ مشاعرے اور تفریح سے دل چسپی رکھنے والے جوق در جوق ان میں شریک ہوتے ہیں مگر اس ساری مقبولیت کے باوجود یہ نکتہ بھی اپنی جگہ پر ہے کہ آج کے مشاعرے میں علمی اور ادبی پہلو

کی نشان دہی نہیں ہوتی۔ اس روایت کے بجائے تفریحی اور وقت گزاری کا پہلو زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ روایت بھی بدلتی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے اسے وقت سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ ریڈیو کا آغاز ہوا تو مشاعرے کی سمعی روایت نے فروغ پایا۔ ٹی وی نے سمعی اور بصری دونوں روایتوں کو برقرار رکھا اور مشاعرے کی مقبولیت میں یوں اضافہ کیا کہ ایک مخصوص مشاعرے میں ملک کے سبھی ناظرین کو شریک کرکے مشاعرے کو گھر گھر پہنچا دیا۔ غالبؔ نے اپنی مکتوب نگاری کے بارے میں فخریہ کہا تھا کہ ”میں نے وہ طرزِ سخن ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔“ اب شعر و سخن کے شیدائی ہزار کوس دور بیٹھے اپنے شاعروں کی نغمہ سرائی سنتے ہیں اور ویڈیو کیسٹ پر ریکارڈ شدہ دبئی، ابوظہبی، جدے اور نیویارک کے مشاعرے دیکھتے ہیں۔ زبانی روایت فلم پر محفوظ ہو کر دائمی سرور کا وسیلہ بن گئی ہے۔ گھر سے نکلنے اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مشاعرہ خود گھر گھر پہنچ گیا ہے۔

علوم کی فراوانی نے شاعری کو متاثر کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں شاعری کا مطالعہ بہت کم ہو جائے گا اور یہ جزوِ زندگی نہیں رہے گی مگر مشرق کا مزاج شعری آہنگ کا مزاج ہے۔ شاعری کا مطالعہ کم ہو یا زیادہ۔ مشاعرے کی علمی، ادبی، تہذیبی اور شعور کو جِلا بخشنے والی خصوصیت برقرار رہے یا نہ رہے، مشاعرہ برقرار رہے گا کیوں کہ اب مشاعرہ محض ایک زبان یعنی اردو کی میراث نہیں رہا۔ ذولسانی مشاعرے، اردو سندھی مشاعرہ، اردو پنجابی مشاعرہ بھی عام ہو گیا ہے۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ انگلستان اور امریکا میں اردو انگریزی مشاعروں کا دور بھی جلد شروع ہونے والا ہے۔

مظہر محمود شیرانی☆

مکاتیبِ ڈاکٹر اسلم فرخی مرحوم بنام مظہر محمود شیرانی

۱۵/ جون ۲۰۱۶ء کو میرے شفیق اور محترم بزرگ پروفیسر اسلم فرخی صاحب راہیِ ملک عدم ہوگئے۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔ گزشتہ تیس برس سے میں ان کا نیاز مند تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے پہلی بار سنہ ۱۹۸۵ء میں ان کی زیارت ہوئی تھی اور مل کر دل خوش ہوا تھا۔ کراچی اور لاہور کے مابین طویل فاصلے کے باعث ملاقاتیں تو کم کم ہوئیں البتہ خط کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ میں ان کے احترام کے پیشِ نظر بلاوجہ عریضہ ارسال نہیں کرتا کہ انھیں جواب لکھنے کی زحمت نہ ہو البتہ جب میری کوئی کتاب شائع ہوتی تو اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ضرور بھیجتا تھا۔ وہ اپنے اخلاق عالیہ کے باعث اس کی رسید کے اطلاعی خط سے ضرور نوازتے تھے اور میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ کبھی انجمن ترقیِ اردو کی بعض مطبوعات یا ''قومی زبان'' اور ''اردو'' کے مطلوبہ پرچوں کے لیے بھی تکلیف دیتا تھا۔ میری ایسی درخواست پر وہ خصوصی توجہ فرماتے۔

مرحوم صحیح معنی میں استاذالاساتذہ کہلانے کے مستحق تھے۔ چنانچہ ایک بار میرے کالج کے میگزین ''مرغزار'' میں چھپنے والے ایک مضمون میں مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی تو بروقت اس کی تصحیح کی۔ میرے تحریر کردہ خاکے انھیں پسند آئے تو ان کی کھل کر تعریف کی جس سے میری ہمت بندھی۔ اپنی کچھ مطبوعات بھی مجھے عطا کیں۔ پھر میری والدہ کی وفات پر بڑی اپنائیت سے تعزیتی خط لکھا جس سے بڑی ڈھارس ہوئی، میرے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعے ''کہاں سے لاؤں انھیں'' پر عزیزی ڈاکٹر آصف فرخی نے انگریزی میں تبصرہ لکھا تو مرحوم نے اس کا عکس مجھے بھیجا اور اس کے حاشیے پر اپنے قلم سے یہ دو سطریں لکھیں: ''مخدومی ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم! یہ تبصرہ ۲۹/ اپریل ۲۱۰۲ء کے روزنامہ ''ڈان'' میں شائع ہوگیا۔ تبصرے کی تصویر کی نقل پیشِ خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، بیگم صاحبہ اور صاحب زادوں کو صحت مند، مسرور اور مطمئن

☆ سابق صدر شعبۂ فارسی، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور

رکھے۔ آمین۔

دعاگو و دعاجو اسلم فرخی"

آخر آخر میں امراض کے غلبے کی وجہ سے لکھنے پڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ اس عالم میں بھی ان کی محبت کا ایک مظاہرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ جب مولانا عبدالحلیم شرر کی کتاب "گزشتہ لکھنؤ" کی تازہ اشاعت پر میرا طویل تبصرہ جامعہ پنجاب کے مجلہ "تحقیق" (جنوری۔مارچ ۲۰۰۹ء) میں چھپا تو ان کی نظر سے بھی گزرا۔ ایک دن میں جی سی یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا تو کسی نے اطلاع دی کہ کراچی سے ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ اس سے پہلے وہاں ان کا فون کبھی نہیں آتا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں گیا تو واقعی انھی کا فون تھا۔ انھوں نے میرے تبصرے کی اتنی تعریفیں کیں کہ بس کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید والا مضمون ہوا۔ چند منٹ بعد جب ان کے ارشادات ختم ہوئے تو میں نے عرض کی کہ حضرت آپ نے بڑی ذرہ نوازی کی لیکن فون پر کی گئی یہ باتیں تو ہوا میں تحلیل ہو جائیں گی اور ان میں سے کچھ مجھے یاد بھی رہیں گی تو گونگے کے خواب کی طرح میں کسی کو بتا بھی نہ سکوں گا۔ اگر آپ ان میں سے نصف بھی اپنے قلم سے لکھ بھیجتے تو میرے لیے ایک قیمتی سند ہو جاتی۔ فرمانے لگے۔ میں اب لکھنے کے قابل نہیں ہوں۔ ہاتھوں میں رعشہ آگیا ہے۔ اسی لیے فون کا سہارا لیا ہے۔ اس اطلاع سے مجھے بڑا دکھ ہوا اور اب تو ہم اس وجودِ عزیز ہی سے محروم ہو گئے ہیں بس یادیں رہ گئی ہیں۔ میں مرحوم کی مجھ پر شفقتوں کے اعتراف اور اُن سے اظہارِ عقیدت کے طور پر اُن کے نوازش نامے ماہ نامہ "قومی زبان" کے خصوصی شمارے میں اشاعت کی غرض سے ارسال کر رہا ہوں۔

— ۱ —

۱۹۸۶/۸/۲۵ء

مکرمی ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم!

آپ کا ارسال کردہ تحفہ یعنی "مقالاتِ شیرانی" جلد ہشتم موصول ہوا۔ میں اس تحفے کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے بڑی توجہ، محنت اور لگن سے شیرانی صاحب کے مقالات یک جا

کیے ہیں۔ اس علمی کارنامے کے لیے پوری اردو دنیا آپ کی شکر گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو رواں دواں اور علمی لگن کو ہمیشہ قائم رکھے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

اسلم فرخی

—۲—

۱۰/ جون ۱۹۸۷ء

مکرمی ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

گرامی نامہ موصول ہوا۔ ''اردو'' کا مطلوبہ شمارہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا جارہا ہے۔

''قومی زبان'' اور ''اردو'' مسلسل آپ کی خدمت میں روانہ کیے جارہے ہیں۔ تعجب اور افسوس ہے کہ نہیں پہنچے۔ ''قومی زبان'' کے تمام شمارے بھجوا رہا ہوں امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

نیاز مند

ڈاکٹر اسلم فرخی

—۳—

۱۳/ اپریل ۱۹۸۹ء

مخدومی مکرمی ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

گرامی نامہ مؤرّخہ ۲/ اپریل ۸۹ء موصول ہوا۔

''اردو'' آپ کی خدمت میں پابندی سے جاتا رہے گا۔ اطمینان رکھئے کہ اب ہماری طرف سے اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ اردو کے لیے کوئی تحقیقی مضمون جلد عنایت فرمایئے۔ ۸۶ء، ۸۷ء اور ۸۸ کے بارہ شمارے آپ کی فرمائش کی ہوئی کتابوں کے ساتھ ارسال کر دیئے جائیں گے۔ آپ نے کتابوں کی جو فہرست ارسال کی ہے اس میں نمبر ۵ ''بابائے اردو مولوی عبدالحق'' مرتبہ ڈاکٹر احمر رفاعی درست نہیں ہے۔ یہ کتاب شہاب الدین ثاقب کی مرتب کی ہوئی ہے۔

کتابوں کے سلسلے میں آپ کو ۳۳فی صد کمیشن دیا جائے گا۔ یہ کمیشن اہلِ علم کے لیے بھی ہے۔

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا اور آپ "اردو" کے لیے جلد کوئی مضمون مرحمت فرمائیں گے۔ آپ کے لکھتے ہی کتابیں روانہ کر دی جائیں گی۔

نیاز مند
ڈاکٹر اسلم فرخی

— ۴ —

۱۹؍ مئی ۱۹۸۹ء

مکرمی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ موصول ہوا مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ گزشتہ سال علیل تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مسرور، صحت مند اور مطمئن رکھے اور آپ پوری لگن اور تندہی سے علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کو تمام کتابیں پارسل کے ذریعے سے بھجوا دیں گے اور قیمت کا بل بھی روانہ کر دیں گے۔ آپ چیک کے ذریعے ادائیگی کر دیجیے۔ دنیا میں سارے کام اعتبار پر چلتے ہیں۔ انجمن آپ جیسے اہلِ علم سے پیشگی رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتی بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست از سرِ نو مرتب کر کے فوری طور پر مجھے بھجوا دیں تاکہ کتابیں روانہ کر دی جائیں۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔

نیاز مند
ڈاکٹر اسلم فرخی
مشیر علمی و ادبی

— ۵ —

۲۴/جولائی ۱۹۹۰ء

مکرمی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ رسالہ ''اردو'' کے ۸۹ء اور ۹۰ء کے مکمل شمارے آپ کی خدمت میں علاحدہ سے ارسال کیے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ بحفاظت تمام پہنچیں گے۔

''اردو'' کے لیے کوئی نیا مضمون جلد عنات فرمایئے۔

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔

نیاز مند

ڈاکٹر اسلم فرخی

مشیر علمی وادبی

— ٦ —

۱۰/اگست ۱۹۹۳ء

مخدومی مکرمی ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

مزاج گرامی۔

آپ کا ارسال کردہ تحفہ ''حافظ محمود شیرانی'' نظر نواز ہوا۔ ماشاء اللہ تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوتے کو دادا کی جس علمی اور تحقیقی لگن سے بہرہ ور کیا تھا، پوتے نے ریاضت اور شوق سے اسے درجہ کمال تک پہنچادیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

نیاز مند

ڈاکٹر اسلم فرخی

مشیر علمی وادبی

— ۷ —

۲۶؍نومبر ۹۵ء

مخدومی ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

اللہ تعالیٰ کے فرض و کرم سے امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔ ''حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی ادبی خدمات'' کی دوسری جلد موصول ہوئی۔ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اس علمی ارمغان کے لیے مجھے یاد رکھا۔ ماشاء اللہ نہایت عالمانہ اور محققانہ کام ہے۔ میں اسے آہستہ آہستہ اطمینان کے ساتھ پڑھوں گا۔ تاہم صرف ایک نظر ڈالنے سے اس کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو رواں دواں رکھے اور آپ وقیع علمی کارنامے سے انجام دیتے رہیں۔

میں خرابیِ صحت کی وجہ سے انجمن سے سبک دوش ہو گیا ہوں۔ لیکن لکھنے پڑھنے کا کام جاری ہے ''مرغزار'' کا تازہ شمارہ بھی دل چسپ اور مفید ہے۔ اس کے بعض مضامین اہمیت رکھتے ہیں۔ اتفاق سے میرے یہاں ان دنوں کالج میگزین کا بڑا چرچا ہے۔ بیوی گورنمنٹ کالج برائے خواتین کی پرنسپل ہیں اور کالج میگزین کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ میں نے ''مرغزار'' کا شمارہ انھیں دکھایا اور انھوں نے اسے فوراً کالج لائبریری کے لیے ضبط کر لیا۔ پسند بھی کیا اور ادارتی سلیقے کی داد دی۔

احترامات کے ساتھ

نیاز مند

اسلم فرخی

— ۸ —

۸؍اپریل ۲۰۰۰ء

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ بعافیت ہوں گے۔

آپ کا ارسال کردہ تحفہ ''مرغزار'' کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ قبول فرمایئے۔ ''☆گل

نبی'' کا خاکہ بہت پسند آیا۔ کاش ہمارے معاشرے میں کچھ اور گل نبی ہوتے۔ اس طرح کے خاکے کچھ اور لکھیے۔ آپ کے مضمون ''پروفیسر شمس الدین'' میں (صفحہ ۱۰۸) پر سہواً درج ہے کہ عالمگیر ثانی بہادر شاہ ظفر کے والد تھے۔ میرا خیال ہے کہ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شاہ عالم ثانی کے پوتے تھے۔

اتنی مدت کے بعد آپ کی خیریت معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند، مسرور اور مطمئن رکھے اور آپ کا قلم رواں دواں رہے۔ آمین

نیاز مند
اسلم فرخی

— ۹ —

۵/ جون ۲۰۰۰ء

برادرم ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط اور منسلکہ خاکے مل گئے تھے۔ اب آپ کے خاکوں کا مجموعہ آجانا چاہیے۔ آپ کے خاکے پڑھ کر مجھے بڑا لطف آیا۔ یہ خاکے انسان شناسی کے گہرے شعور اور زبان و بیان کی لطافت کے حامل ہیں۔ بڑا حسن ہے آپ کے خاکوں میں۔

''دبستانِ نظام'' اور دوسری کتابیں پیش خدمت ہیں۔ امید ہے کہ آپ مطالعے کے بعد اپنے تاثرات سے آگاہ فرمائیں گے۔

مرشدی و استاذی ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب قبلہ کی علمی خدمات کے حوالے سے ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ ہے۔ کیا آپ ازراہ نوازش اس کتاب کے لیے ڈاکٹر صاحب قبلہ کی تحقیقی خدمات پر مضمون تحریر فرمائیں گے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے اور اس عاجز کو دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

نیاز مند
اسلم فرخی

— ۱۰ —

۳؍اگست ۲۰۰۰ء

مخدومی ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

گرامی نامہ مل گیا تھا۔ جواب میں تاخیر کی وجہ علالت ہے۔ امید ہے کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کمپوزنگ کی غلطیوں کا کوئی علاج نہیں۔ ''دبستان نظام''، بڑے غور سے پڑھی تھی لیکن بعض قبیح غلطیاں رہ گئیں۔ شروع میں جو منقبت ہے اس میں دو غلطیاں اور متن میں ایک جگہ دو سطریں کمپوز ہونے سے رہ گئیں جن سے مطلب خبط ہو گیا۔ آپ نے ''نظام رنگ'' کی جن غلطیوں کی نشان دہی کی ہے ان کی طرف بعض دوسرے احباب نے بھی اشارہ کیا تھا۔ بہر حال میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے کتاب اتنی توجہ سے پڑھی۔ یہ دراصل آپ کے دودمانِ علمی کا مثبت اور خوش گوار اثر ہے۔

''نفرک'' کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ قاضی صاحب کو اس لفظ اور اس روایت کی صحت پر اعتراض ہے قاضی صاحب میرے بزرگ کرم فرما تھے۔ میں نے ان سے زبانی بھی عرض کیا تھا۔ دراصل آزاد پر ان کی گرفت ناواجب یوں ہے کہ وہ سرے سے اس قسم کی روایت ہی کے قائل نہیں ہیں۔

میرے خاکوں کا ایک مجموعہ ''گلدستۂ احباب'' کئی برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اب دوسرا مجموعہ کمپوز ہو رہا ہے۔ مسئلہ وہی تصحیح کا ہے۔ شائع ہونے پر ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

شیخ فضل الرحمن گنج مراد آبادی بہت بڑے بزرگ تھے۔ جو بھی ان کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ شاد کام واپس آیا۔ میری ایک دادی اپنے بچپن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔ وہ تذکرہ کرتی رہتی تھیں۔ شاہ صاحب کے بارے میں جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں وہ سرسری ہیں۔ ایک مستند کتاب کی ضرورت ہے۔ آپ ہمت کیجیے اور ہاں ڈاکٹر غلام مصطفی خان صاحب قبلہ کے بارے میں مضمون کی توقع ہے۔ آپ کے مقالے سے مجموعے کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ خاکوں کا مجموعہ جلد شائع کیجیے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

نیاز مند

اسلم فرخی

— ۱۱ —

۲۹؍نومبر ۲۰۰۴ء

مخدومی ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ مشفق خواجہ صاحب کے خط سے ساری بات واضح ہوگئی۔(۱) رہبر صاحب نے انھیں ٹھکانے لگا دیا اور مولوی عبدالحق کا نام بلاوجہ شامل کرلیا تاکہ وہ خود الزام سے محفوظ رہیں۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بھی "ایک نمونہ ہے بے مثالی کا" میں نے آپ کے خاکے پڑھے۔ بعض خاکے بہت اچھے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ خیال آیا کہ ان کا مجموعہ شائع ہونا چاہیے۔ آپ دیر کیوں کر رہے ہیں۔ بسم اللہ کیجیے اور مجموعہ مرتب کر دیجیے۔

میری صحت ان دنوں قدرے بہتر ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ دعاؤں کا طالب ہوں۔

نیاز مند

اسلم فرخی

— ۱۲ —

۶؍جولائی ۲۰۰۶ء

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا ارسال کردہ تحفہ "بے نشانوں کا نشان" (۲) موصول ہوا۔ بعض خاکے پہلے پڑھ چکا تھا لیکن دوبارہ پڑھے اور نیا لطف محسوس کیا۔

حضرت سلطان جیؒ نے اپنی ایک مبارک مجلس میں بیان فرمایا کہ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کثیر السیاحت بزرگ تھے۔ ایک دفعہ ان کا گزر ملنگوں کے ایک گروہ میں ہوا۔ ان میں بیٹھ گئے اور

دیکھا کہ وہاں ایک نور ظاہر ہو رہا ہے۔ غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ نور ایک ملنگ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ شیخ آہستہ سے اس کے پاس پہنچے اور دریافت کیا کہ تم ان لوگوں میں کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا ''تاکہ زکریاؒ کو معلوم ہو جائے کہ ہر عامی میں ایک خاص بھی ہوتا ہے۔''

مجھے آپ کے خاکے پڑھ کر یہ ملفوظ یاد آیا۔ ہر عامی میں ایک خاص بھی ہوتا ہے جو ہر شناس اسے پہچان لیتا ہے اور اس معرفت کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ عام میں خاص کو تلاش کر لینا ہی اصل فن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فن سے خوب نوازا ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح کے خاکے لکھتے رہیں اور انسانیت کا پرچم بلند رکھیں۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہو گا۔ اس خط کے ساتھ پانچ کتابوں کا ایک گل دستہ بھی ارسال ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نیاز مند
اسلم فرخی

— ۱۳ —

۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۷ء

برادرم ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ آپ کا گرامی نامہ اور مضمون کا تراشہ ملا۔ میں نے مضمون بڑے غور سے پڑھا اور ساری حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی۔ کردار کشی کا مقصد اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔ امانت کا تقاضا نہ ہو اور کسی قسم کا شک و شبہ بھی ظاہر نہ کیا جائے۔ بڑا افسوس ہوا لیکن آپ کے مضمون سے حقائق پوری طرح واضح ہو گئے۔ آپ نے ایک ناروا اور بیہودہ الزام کا ازالہ کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ حضرت اختر شیرانی بے یارومددگار نہیں بلکہ ملک گیر شہرت کے حامل بزرگ تھے ان کی وفات کے حوالے سے جو ڈراما تیار کیا گیا وہ سراسر لغو اور بے بنیاد تھا۔ اختر شیرانی مرحوم کی کردار کشی بہت ہوئی لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود وہ سادہ دل بے نیاز اور دنیا کے مکر وفریب سے بے خبر محبت اور صرف محبت کے نغمہ خواں تھے۔

میں اس مہینے کے آغاز سے بیمار ہوں۔ سب سے بڑا مرض بڑھاپا ہے۔ ان دنوں گھر سے

باہر نکلنے پر بھی پابندی ہے۔

آپ کے خاکوں کا مجموعہ کب شائع ہو رہا ہے۔ آپ کے بعض خاکے لاجواب ہیں انھیں جلد از جلد کتابی صورت میں منظرِ عام پر آنا چاہیے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت، صحت مند اور مطمئن رکھے۔ آمین!

نیاز مند

اسلم فرخی

— ۱۴ —

۱۵/ دسمبر ۲۰۰۴ء

مخدومی ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ والدہ صاحبہ کے سانحۂ ارتحال پر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے مراتب بلند ہوں۔ آمین۔

ماں سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ ماں وہ شجرِ سایہ دار ہے جو ہر آفت سے بچاتا ہے۔ ماں کی موجودگی میں کسی بات کی فکر نہیں ہوتی۔ کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ آپ بہت بڑی نعمت سے محروم ہوگئے۔ صبر کیجیے اور مرحومہ کی یاد کا چراغ روشن رکھیے۔ زمانہ ہوگیا کہ میں اس نعمت سے محروم ہوگیا لیکن یاد کا چراغ آج بھی روشن ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جو ماں یاد نہ آتی ہوں۔ مگر چارہ کیا ہے۔ فقط صبر۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

نیاز مند

اسلم فرخی

— ۱۵ —

یکم اپریل ۲۰۱۵ء

مخدومی ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ اور تحفۂ محبت موصول ہوا۔(۴) بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے خاکہ نگاری میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ بڑے شہر دیہاتوں اور چھوٹے شہروں کو ہڑپ کرتے جاتے ہیں۔ بڑے شہروں کی زندگی مصنوعی اور خلوص و محبت سے عاری ہے کسی کو یہ نہیں معلوم کہ دیوار بیچ کون رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ وہ بھی معروف اور یہ بھی معروف، ایک دوسرے کو کس طرح پہچانیں اور دکھ درد میں شریک ہوں۔ آپ کے خاکوں کا مجموعہ ایک یادگار اور عہد آفریں مجموعہ ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند مسرور اور مطمئن رکھے اور آپ کا قلم رواں دواں رہے۔ افسوس کہ اب نہ لکھا جاتا ہے نہ پڑھا جاتا ہے۔ یہ بھی بڑی ہمت سے لکھا گیا ہے سطریں ٹیڑھی اور مضمون سطحی اور سرسری۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

نیاز مند

اسلم فرخی

حواشی

۱۔ میں نے اپنے خط میں ڈاکٹر داؤد رہبر کی ایک غلط بیانی پر روشنی ڈالی تھی اور اپنی تائید میں مشفق خواجہ صاحب کے میرے نام ایک مکتوب کا عکس بھی ارسال کیا تھا۔

۲۔ میرے لکھے ہوئے خاکوں کا پہلا مجموعہ جو جنوری ۲۰۰۶ میں ”اساطیر“، لاہور نے شائع کیا تھا۔

۳۔ میرا یہ مضمون ڈاکٹر داؤد رہبر کے بیانات کی تردید میں ”چہ دلاوریست دزدے“ کے عنوان سے ماہ نامہ ”تخلیق“ (لاہور) کے شمارہ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں چھپا تھا۔

۴۔ میرا خاکوں کا دوسرا مجموعہ ”کہاں سے لاؤں انھیں“ مراد ہے۔

۞۞

مسعود اشعر

موسمِ بہار جیسے لوگ

”اتوار کی صبح تھی۔ سنہ یاد نہیں۔ سنہ بھی کوئی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ یاد رکھنے کی چیز سن ہے — اپنا بھی اور پرایا بھی — بید کے صوفے پر ایک صاحب بیٹھے تھے جو میرے لیے اجنبی تھے، ملگجی قمیص ملگجا پیجامہ، لمبا قد۔ انھیں دیکھ کر مجھے دلّی کے معماروں کی ایک اصطلاح یاد آگئی، 'شیر دہاں۔' ہندوؤں کے مکان گاے کے منھ کی طرح لمبے، پتلے اور سرنگ نما ہوتے تھے۔ انھیں 'گوئمکھ' کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے مکانوں کا سامنا بڑا، شان دار، خوب چوڑا اور پررعب ہوتا تھا۔ یہ 'شیر دہاں' کہلاتے تھے۔ جو صاحب صوفے پر بیٹھے تھے، ان کا چہرہ شیر دہاں تھا۔ بہت چوڑا، بہت بڑا سر، آنکھوں پر عینک تھی، مگر عینک کے پیچھے ایک شوخ اور شریر بچے کے منھ چڑانے کی جھلک تھی۔ کلے جبڑے سے اعتماد ٹپکتا ہوا، مگر چہرے کے علاوہ باقی جسم کا انداز ڈھیلا ڈھالا سا تھا۔ ہاتھ پیر بڑے ہونے کے باوجود کچھ لجلجے لجلجے، انداز میں بے چینی، پان کھا نہیں رہے تھے، چبا رہے تھے۔ میں سلام کرکے انھی کے برابر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد انھوں نے کلائی سے گھڑی اتاری اور اس کی زنجیر سے کھیلنے لگے۔ کچھ عجیب سی بے چینی تھی، میرا تاثر یہ تھا کہ اس وقت ان کی رگِ تخلیق پھڑک رہی ہے اور ان کا ذہن تقریر یا تحریر کے ذریعے کچھ نہ کچھ ظاہر کرنے کے لیے بے تاب ہے۔“

یہ تحریر ہے، ایک ایسے بے مثال انشا پرداز کی جو پچھلے ہفتے ہم سے بچھڑ گئے اور میں نے اس کالم کو جو عنوان دیا ہے، وہ بھی ان کی ایک کتاب کا ہی نام ہے۔ یہ تھے ڈاکٹر اسلم فرخی۔ وہ محمد حسین آزاد کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کہتے تھے اور بلاشبہ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ لیکن آپ اوپر کی تحریر پڑھ کر بتایئے، کیا ایسی انشا اور ایسی زبان لکھنے والا آج ہمارے آس پاس کوئی اور ہے؟ اس لیے میں نے انھیں بے مثل انشا پرداز کہا ہے۔ یہ آرائشی یا انگریزی محاورے کے مطابق flowery زبان نہیں ہے۔ سیدھی سادی بول چال کی زبان ہے۔ کہیں لفاظی کے کلی پھندنے

نہیں لگے ہوئے۔ بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور آپ اسے ایسے پڑھتے ہیں جیسے کوئی داستان یا کہانی۔ اوپر جو تحریر نقل کی گئی ہے وہ اردو کے معروف ناول نگار اور نقاد ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے شخصی خاکے کا ابتدائی حصہ ہے۔ اب آپ باقی تفصیل پڑھتے رہیے کہ احسن فاروقی صاحب کیسے استاد تھے اور کیسے ناول نگار و افسانہ نگار تھے؟ مگر ڈاکٹر اسلم فرخی نے تو چند سطروں میں ہی ان کی شخصیت کے پورے خد و خال آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اور یہی ان کے تمام خاکوں کا خاصا ہے۔ انھوں نے جس کا بھی خاکہ بھی لکھا اسے جیتا جاگتا پڑھنے والے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اب وہ شاہد احمد دہلوی ہوں، شاہد صاحب کے بڑے بھائی ہوں، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ہوں، مشتاق احمد یوسفی ہوں، مشفق خواجہ ہوں، آغا اشرف ہوں، مولانا رازق الخیری ہوں، احمد فراز ہوں یا ڈاکٹر صاحب کے وطن کی کوئی ایسی شخصیت جسے آپ بالکل نہیں جانتے۔ اسلم فرخی صاحب کے خاکوں میں وہ سب آپ کو اپنے جانے پہچانے نظر آنے لگتے ہیں۔ ان خاکوں میں ڈاکٹر اسلم فرخی کی اپنی زندگی کے نشیب و فراز بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اور ہاں، ایک اعتبار سے اپنی خود نوشت لکھنے کا یہ بھی ایک معقول طریقہ ہے اور کیسا اچھا طریقہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان کراچی سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی تدریسی زندگی شروع ہوتی ہے۔ دو کالجوں میں پڑھانے کے بعد کراچی یونی ورسٹی جاتے ہیں۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد انجمن ترقیِ اردو پاکستان کے مشیرِ علمی و ادبی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی اوّل و آخر استاد تھے۔ استادوں کے استاد۔ وہی قدیم استادوں والی وضع داری اپنے ہونہار شاگردوں کو یاد رکھنا۔ وہی آخر عمر تک اپنے پرانے شاگردوں کی ہی نہیں بلکہ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کی رہنمائی کرنا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر کے آخری ایک دو سال کا تو مجھے علم نہیں، لیکن تین چار سال پہلے ایک اتوار کی صبح میں گلشنِ اقبال، کراچی میں ان کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ان کے ڈرائنگ روم میں ان سے ملنے والوں کا ہجوم ہے۔ ان میں ان کے وہ شاگرد بھی ہیں جنھیں انھوں نے پی ایچ ڈی کرایا اور وہ لکھنے پڑھنے والے بھی ہیں جو ان سے علمی استفادہ کرنے آئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بیٹھک اسی طرح ہر اتوار کو جمتی ہے اور ہر اتوار کو ڈاکٹر صاحب اسی طرح سب کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انھوں نے کتنے شاگردوں کو ڈاکٹریٹ کرائی؟ اس

کا علم ان کی چہیتی شاگرد ڈاکٹر فاطمہ حسن کو ہو تو ہو، وہ خود تو شاید یہ تعداد بھول گئے ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیچھے ان ہونہار شاگردوں کی ایک لمبی قطار ہی نہیں چھوڑی بلکہ اپنے صاحب زادے ڈاکٹر آصف فرخی کی شکل میں اپنا انتہائی قابلِ قدر ورثہ اور بے بہا سرمایہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔ کم سے کم میری دانست میں آصف جیسا علم و ادب کا رسیا اور کوئی نہیں ہے۔ مغرب ہو یا مشرق کا ادب، مغربی ادب کی کتابیں ہوں یا مشرقی ادب کی کتابیں، آصف کی نظر سے گزرے بغیر کوئی کتاب رہ ہی نہیں سکتی۔ اور پھر افسانہ ہو یا تنقید، اردو ہو یا انگریزی، ہر میدان میں آصف کا جھنڈا لہراتا نظر آتا ہے اور یہی ڈاکٹر اسلم فرخی کا بے بہا ورثہ ہے۔

اب میں یہ بھی بتادوں کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''گلدستۂ احباب''، ''آنگن میں ستارے''، ''لال سبز کبوتروں کی چھتری''، ''موسمِ بہار جیسے لوگ'' اور ''رونقِ بزمِ جہاں۔'' ان خاکوں میں زبان کی وہ چاشنی ہے کہ خاکے پڑھنے کے بعد بھی آپ ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں مگر یہی چاشنی ان کی دوسری کتابوں میں بھی تو ہے۔ وہ محمد حسین آزاد پر کتابیں ہوں یا حضرت نظام الدین اولیا پر۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ محمد حسین آزاد پر تحقیق کرتے ہوئے وہ ان پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ انھی کا اسلوب اور انھی کا انداز بیان انھوں نے اپنالیا۔ لیکن یہ صرف آزاد کا انداز ہی نہیں ہے بلکہ اس میں غالبؔ کی بول چال والی چاشنی بھی شامل ہے جو اسے دو آتشہ بناتی ہے۔ میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ کسی بھی محاورے یا کسی بھی کہاوت کے بارے میں مجھے کوئی شبہ ہوتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ انتظار حسین یا ڈاکٹر اسلم فرخی سے پوچھ لوں گا۔ انتظار حسین کے بعد ڈاکٹر اسلم فرخی ہی رہ گئے تھے جو میری مدد کرسکتے تھے۔ افسوس، اب وہ بھی نہ رہے اور صاحب، ڈاکٹر اسلم فرخی نے جن لوگوں کے خاکے لکھے، انھیں انھوں نے ''موسمِ بہارِ جیسے لوگ'' کہا ہے اور اب، انھی موسمِ بہار لوگوں میں وہ خود بھی شامل ہو گئے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر فاطمہ حسن☆

میرے استاد ڈاکٹر اسلم فرخی

یہ سال ۲۰۰۰ء کی بات ہے جب میں نے ڈاکٹر اسلم فرخی کی نگرانی میں ایم فل / پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی زیرِ نگرانی پہلے سے ہی پانچ چھ طلبہ مقالے لکھنے میں مصروف تھے۔ میری تجویز پر یہ طے پایا کہ ہفتے میں ایک دن سب اکٹھے ڈاکٹر صاحب کے پاس آجایا کریں گے۔ یوں ہمارا ہر ہفتے ان کے پاس جانے کا سلسلہ شروع ہوا جو سولہ برس تک یعنی ان کے انتقال سے دو ہفتے قبل تک جاری رہا۔ ابتدا میں جو ملاقاتیں صرف مقالے تک محدود رہتی تھیں وہ وسیع تر مطالعے پر مشتمل ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر استاد تھے اور شفقت ان کی ذات میں رچی بسی تھی۔ شاگردوں کے لیے ان کے گھر کے دروازے ہی نہیں علم و آگاہی کے سارے دریچے وا رہے۔ ان کا مطالعہ اور یادداشت دونوں ہی غیر معمولی تھی۔ شعر و ادب کے حوالے یوں دیتے جیسے کتاب پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ بلا مبالغہ ہزاروں اشعار انھیں یاد تھے۔ ان میں بڑے چھوٹے، کلاسک یا اساتذہ کی تخصیص نہیں تھی۔ بس کسی شاعر کا ذکر آتا تو اس کا عہد اور اشعار دونوں ہی ڈاکٹر صاحب کا موضوع بن جاتے، ان ہفتہ وار ملاقاتوں میں ہم شاگرد ہی نہیں علم و ادب سے تعلق رکھنے والے دیگر لوگوں نے بھی آنا شروع کر دیا خصوصاً جب کوئی بیرونِ شہر سے آتا تو اسے ڈاکٹر صاحب کے یہاں سجی سجائی ادبی محفل مل جاتی اور ڈاکٹر صاحب کا خیر مقدم کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ایک بار آنے والا بار بار آتا۔ ویسے بھی ہمارے عہد میں دشتِ علم و ادب کی سیاحت کرنے والا شاید ہی کوئی ہو جس کی ملاقات ڈاکٹر اسلم فرخی سے نہ ہوئی ہو یا انھیں نہ دیکھا ہو اور ان کی گفتگو نہ سنی ہو۔ جامعہ میں تدریس کی صورت، کسی سنجیدہ محفل میں تقریر کی صورت ان کے اپنے گھر میں علم کی جستجو رکھنے والوں کے درمیان یا کسی شخصیت کا خاکہ پڑھتے ہوئے جسے انھوں نے تحریر کیا ہو، یادیں دہراتے، کتابوں کے حوالے دیتے، اذہ کے شعروں پر

☆ معتمد اعزازی، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی

شعر سناتے، مجسمۂ شفقت، علم اور اخلاق ڈاکٹر اسلم فرخی سے جو بھی ایک بار ملا ملتا ہی رہا۔ بلاشبہ ڈاکٹر اسلم فرخی عصرِ حاضر کے ایسے ادیب، شاعر، ناقد، محقق اور استاد تھے جن کی ہمہ جہت شخصیت کو ایک مضمون میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف ان کا تحقیقی کارنامہ "محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف" دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ دوسری طرف ان کے لکھے ہوئے متعدد خاکے ہیں۔ آزادؔ جنھوں نے "آبِ حیات" لکھ کر نہ صرف ایک پورے عہد کو بقائے دوام بخشا بلکہ اردو نثر کی روایت میں نئے اسلوب کا اضافہ کیا۔

آزاد پر لکھنے کے لیے زبان و بیان پر وہی دسترس، مشاہدے کی باریک بینی اور گہری انسان دوستی چاہیے تھی جو آزاد میں تھی۔ یہ اوصاف ڈاکٹر اسلم فرخی کو بھی درجۂ کمال تک عطا ہوئے۔ انھوں نے محمد حسین آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھا تو لکھتے چلے گئے اور تین برس میں بڑی دل جمعی سے تحقیق کر کے ۱۹۶۰ء میں یہ مقالہ مکمل کیا۔ محمد حسین آزاد کے خاندان سے پشتینی قربت اور ان کی تصانیف کے عمیق مطالعے نے ان کی ذات کے کسی گوشے کو تاریک نہ رہنے دیا۔ "محمد حسین آزاد: حیات و تصانیف" کے عنوان سے یہ مقالہ دو جلدوں میں انجمن ترقیِ اردو نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس مقالے پر ۱۹۶۵ء میں داؤد ادبی ایوارڈ بھی ملا۔ اس کا نیا ایڈیشن بھی انجمن نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ آزاد کی صد سالہ برسی کے موقع پر "نگارستانِ آزاد" ایک اور تصنیف ادارۂ شہر زاد نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب محمد حسین آزاد کی حیات و نگارشات کا جامع مطالعہ ہے۔ آزاد کی شخصیت سے غیر معمولی تعلق ان کی تصنیفات کے وقیع تحقیقی مطالعے اور طویل مقالے کے بعد ان پر ایک اور تصنیف کتنی جامع اور مصدقہ ہو گی؟ اس پر دو رائیں تو ہو ہی نہیں سکتیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس کتاب میں عام قاری کے لیے بےحد کشش ہے۔ ایک تو آزاد کی تصانیف کے بیان میں جامعیت، دوسرے آزاد کا شخصی خاکہ اور وہ بھی ڈاکٹر اسلم فرخی کے قلم سے، جن کی تمام تخلیقی خوبیوں پر خاکہ نگاری مقدم ٹھہری۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے اٹھانے کے بعد اختتام تک پڑھے بغیر رکھا نہیں جاسکتا۔ "آبِ حیات" میں آزاد نے انشا پردازی کی جو تعریف کی ہے اسے اچھی نثر اور کامیاب خاکہ نگاری کا پیمانہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

”فارسی اور اردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشامیں آسانی ہے، اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لایق ہے۔ وہ یہ ہے کہ بھاشازبان جس شے کا بیان کرتی ہے، اس کی کیفیت ہمیں ان خط وخال سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے سننے، سونگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی، مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے وہ سننے سے آجاتا ہے۔“

انشا پردازی کا یہ کمال ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں میں نمایاں ہے۔ وہ قارئین جن کی نظر سے ان کے خاکے گزرے ہیں، جانتے ہیں کہ ان خاکوں میں صرف شخصیات نہیں، ایک عہد سماجی، پس منظر اور اقدار وروایات کے ساتھ قلم بند ہوا ہے۔ ان کے خاکوں کے مجموعے ”گلدستۂ احباب“، ”سات آسمان“ اور ”لال سبز کبوتروں کی چھتری“ اور ”آنگن میں ستارے“ منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ آج کے عہد میں خاکہ نگاری کی تاریخ وتعریف ان دو کتابوں کے بغیر متعین نہیں ہو سکتی۔ وہ کوئی عام شخصیت ہو یا خواص میں سے ہو، ملازم ہو، قرابت دار ہو، ہم عصر ہو یا بزرگ، جس پر قلم اٹھایا یکساں توازن اور شائستگی برقرار رکھی۔ ان کے خاکے ہمہ جہت ہوتے ہیں۔ یہ شخصیت اور گرد و پیش کو زندہ و متحرک رکھتے ہیں۔ طبیعت کی سنجیدگی و شوخی، انسانی خوبی و کمزوری، صلاحیتوں کی قدر و مقدار میں توازن اور انسان دوستی برقرار رہتی ہے۔ ان خاکوں میں زندہ انسان سے ملاقات ہوتی ہے۔ کسی تخلیقی فوق البشر، بت یا مکروہ بدکردار سے نہیں۔ وہ ایک فرد کو اس کی کم زوریوں میں بھی انسان دیکھتے ہیں، شیطان نہیں۔ ان کی انسان دوستی حسن کی کوئی ادا ضرور تلاش کر لیتی ہے۔ منیر نیازی نے لکھا ہے:

ہر کسی کے چہرے پر اک ضیا سی ہوتی ہے
حسن کے علاقے کی اِک ادا سی ہوتی ہے

اس ضیا کو منعکس کرنے کے لیے اپنی ذات کو آئینے کی طرح شفاف رکھنا پڑتا ہے، تب وہ تصویر ابھرتی ہے جو ایک عام انسان کو خاص بنا دیتی ہے۔ خاکہ نگار کا علم مشاہدہ اور تخیّل گزرے ہوئے وقت کو حال میں تبدیل کر دیتا ہے اور ٹھہری ہوئی تصویر کو متحرک بنا دیتا ہے۔ وہ لفظوں سے اپنے تصور کی رو قارئین کے تصور سے ملا دیتا ہے۔ یہی کمال ہے کسی سچے تخلیق کار کا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کا یہ کمال ”نگارستانِ آزاد“ میں عروج پر نظر آتا ہے۔ اس کتاب میں آزاد کا شخصی خاکہ دیکھیے:

”میاں آزاد کی بیس اکیس برس کی عمر، سبزہ آغاز، لباس میں مولویانہ انداز کی جھلک، چوڑا پھیلا ہوا چہرہ، ستواں ناک، روشن آنکھیں، کشمیری خط وخال، گورا رنگ، آواز میں نوجوانی کے زور کی جھلک، بہت ٹھہر ٹھہر کر شعر پڑھتے رہے، ہر شعر پر داد طلب نظروں سے محفل کی طرف دیکھتے، مگر معمولی ہوں ہاں کی آوازیں آتی رہیں۔ مقطع پر اُن کے استاد بھائیوں نے بڑا غُل مچایا۔ استاد خاموش رہے۔ ایک بڑے میاں کہنے لگے، ”بالکل استاد کا سارنگ ہے۔ اِن شاء اللہ ترقی کروگے۔ اسی طرح کہتے رہو۔“

ڈاکٹر اسلم فرخی صرف ظاہر کی تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ حوادثِ زندگی، باطنی کیفیات واحساسات میں جو ارتعاش پیدا کرتے ہیں، ان کی جھلک بھی دکھاتے ہیں۔ گرد وپیش کی مرقع نگاری بھی ساتھ چلتی ہے۔ محمد حسین آزاد پر لکھتے ہوئے انھوں نے ان کے خاندانی حالات، ان کا بچپن اور پرورش وپرداخت کے ہر مرحلے کو بڑی دل سوزی سے لکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو مشہور صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے خاص عقیدت تھی۔ اس عقیدت کا اظہار ان کی کتابیں ”دبستانِ نظام“، ”نظامؒ رنگ“، ”صاحب جی سلطان جیؒ“ اور ”فرید وفردِ فریدؒ“ جیسی بیش بہا کتابوں میں ہوتا ہے۔ ”دبستان نظامؒ“، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور ان کے زیرِ سایہ تربیت وپرورش پانے والے عالمی شہرت کے حامل حضرت امیر خسروؒ، خواجہ حسن سجزیؒ، موؑرخ ضیاء الدین برنی اور سیر نگار امیر خوردؒ کی علمی اور ادبی کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے بعض اور بزرگانِ دین مثلاً غوث الاعظمؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، خواجہ غریب نوازؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے بارے میں مختصر لیکن بڑی اہم کتب مرتب کیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کی توجہ بچوں کے ادب پر بھی رہی۔ انھوں نے بچوں کے لیے حضرت سلطان جیؒ، حضرت امیر خسروؒ، میر امن، مرزا غالب، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا حسرت موہانی اور مولوی عبدالحق کے بارے میں مستند معلومات پر مبنی دل چسپ کتابیں مرتب کیں اور شائع کروائیں۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی پر گو شاعر تھے، فی البدیہہ کہنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے شاعری پر نثر کو فوقیت دی جو شاید ان کے عالمانہ مزاج سے قریب تھی۔ ان کا کلام جو

بکھرا ہوا ہے اسے سمیٹنے اور شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

انجمن ترقیِ اردو پاکستان کے لیے بھی ڈاکٹر اسلم فرخی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ نو برس سے زائد عرصے تک بحیثیت مشیر علمی و ادبی اس ادارے سے وابستہ رہے۔ اس دوران بہترین تحقیقی کتب کی اشاعت ہوئی۔ انھی کی ایما پر عزیز حامد مدنی نے جدید اردو شاعری جیسی اہم کتاب دو جلدوں پر تحریر کی جس کے کئی ایڈیشن انجمن سے شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی عظیم انسان تھے۔ انھیں عالمِ باعمل کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی یاد کے ساتھ ایک فیض رساں ہستی کا پیکر تصور میں آتا ہے۔ ادیب اور مدرّس ان کی شخصیت کے دونوں حوالوں کو یک جا کریں تو وہ اپنی ذات میں پورا دبستان تھے۔ ان کا جدا ہو جانا ایک عصر کے خاتمے کی طرح محسوس کیا جارہا ہے۔